بلوچستان کی ادبی تحریک

ایڈیٹر: شاہ محمد مری

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

مری لیب، فاطمہ جناح روڑ، کوئٹہ

جملہ حقوق سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے نام محفوظ ہیں

کتاب: بلوچستان کی ادبی تحریک

ایڈیٹر: شاہ محمد مری

اشاعت: 2013

قیمت: 300روپے

ملنے کا پتہ:

سنگت بک سینٹر

عظیم میڈیکل سینٹر

بالمقابل مری لیب، فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ

فون:0092-81-2843358

انتساب

قلم اٹھانے والے اولین بلوچ کے نام

فہرست

پیش لفظ راستہ ٹیڑھا میڑھا ہی ہوتا ہے 9

سو سال پہلے 14

بلوچی زبان وادبہ تحریک 15

سال 1949

پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن (بار اول) 16

سال 1950

بلوچی زبان وادبہ دیوان 18

دوسری بار پراگریسو ارئٹرز ایسوسی ایشن 19

دیمارووخیں اولس 20

سال 1967

عوامی ادبی انجمن 20

سال 1986

پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن (بار سوم) 25

سال1989

لوز چیذ غ 26

سال1990

لوز چیذ غ کی تنقیدی نشستیں 35

سال1993

پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن (بار چہارم) 37

جالب کی یاد میں سیمینار 41

سال1997

سنگت اکیڈمی آف سائنسز 46

جمعہ پارٹی سے سنڈے پارٹی 47

پراگریسو ڈاکٹرز فورم اور میر غوث بخش بزنجو فاؤنڈیشن 48

سال2002

دوروزہ بزنجو امن تقریبات 49

سال2003

اگست...... دوروزہ بزنجو تقریبات 55

ستمبر...... لیکچر: بلوچ نیشنل ازم کی بنیادیں اور ارتقا 63

دسمبر...... بیادِ ڈاکٹر خدائیداد 65

سال2005

فروری......جشن عبداللہ جان جمالدینی 68

ستمبر......بلوچستان کا ادب اور خواتین 77

سال2006

پہلی کابینہ 91

سال2007

اپریل......ملتان کانفرنس 91

جون 93

جولائی 94

ستمبر 94

نومبر 95

سال2008

جنوری 95

مارچ......دوسرے انتخابات 96

جون 97

جولائی 97

اگست 101

ستمبر 104

اکتوبر 106

نومبر 107

دسمبر 107

سال2009

جنوری 108

اپریل 116

مئی 119

جولائی 121

اگست......تیسرے انتخابات 123

ستمبر 125

اکتوبر 128
نومبر 129
دسمبر 130

سال2010

مارچ 130
مئی 133
جون 135
جولائی 136
اگست 142
ستمبر 143
اکتوبر 147
نومبر 148

سال2011

جنوری 150
مارچ 150
اپریل 151
اگست 151
نومبر......چوتھے انتخابات 153
دسمبر 156

سال2012

جنوری 157
مارچ 159
اپریل 160

مئی 161
جون 167
جولائی 169
ستمبر 170
دسمبر 175

سال2013

جنوری 176
اسلام آباد شاخ 177
مارچ 179
اپریل 180
مئی 180
اگست 181
اوستہ محمد شاخ 184
ستمبر 185
اکتوبر
اوستہ محمد 188
اسلام آباد 188
کوئٹہ 190
ڈیرہ مراد جمالی شاخ 190
نومبر......مرکزی کمیٹی 191

سنگت اکیڈمی کا آئین 192
ویب سائٹ 199
سنگت کے سربراہان 200

راستہ ٹیڑھا میڑھا ہی ہوتا ہے

سیاست،عقیدہ اور سائنس، ادب سے بہت پیچیدہ اور جدا نہ کیے جاسکنے والے طرز میں گتھم گتھا ہیں۔زندگی کے مسائل نے ادب کو اٹوٹ طور پر اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔زندگی کی مکمل اکائی کے اندر ادب بھی ہے، فلسفہ کا محکمہ بھی اور سیاست کا شعبہ بھی۔اور ادب زندگی کے ساتھ ساتھ چلنے پر مجبور ہے،اگلی صفوں میں،راہنمائی کی حدتک۔ادیب کیسا انسان ہوگا،اگر وہ سماج میں سے نہ ہوگا اور سماج کی ترقی میں حصہ نہیں ڈالے گا؟۔

ہمارا عہد بہت نامحسوس طرز پہ ایک سیاسی ماحول میں ڈھلا ہوا عہد ہے......ادب کے اندر ایک بظاہر غیر سیاسی ماحول میں دراصل خوب سیاست ہوتی ہے۔جو لوگ ادب کو ''غیر سیاسی'' بنانے کے سب سے بڑے وکیل ہیں، وہ وہ سیاسی ادیب دراصل ادب میں سیاست کے خلاف نہیں ہیں، وہ تو ادب میں ''ایک خاص قسم کی سیاست'' کے خلاف ہیں۔وہ ہر اُس ادب کی حمایت کریں گے جس کے پڑھنے سے قاری عقل کا استعمال کم سے کم کرے اور جذبہ ومجذوبی کو خوب خوب استعمال کرے۔ایسا ادب جو تسخیر کائنات کے لیے اکسانے کی بجائے قناعت واکتفا کی تلقین کرے۔مثلاً وہ ادب کے اندر تو ہم پرستی کے سیر سپاٹے کو برا نہیں سمجھتے۔اس میں آپ جس قدر چاہیں بقول محمد علی صدیقی ''گنڈے تعویزوں سے ٹی بی کا علاج'' تجویز کریں، کسی کو اعتراض نہ

ہوگا۔یہ بظاہر غیر سیاسی ادب ہے۔مگر اس میں جس طرح کی ذہنیت پروان چڑھے گی وہ سیاست میں پیر وملاّ کی طاقتوری کو تقویت بخشے گی۔

اسی طرح ادب میں ''جنگ وامن'' کا معاملہ ہے۔غیر سیاسی ادب والا ''سیاسی'' ادیب جنگیں چھیڑ کر بھی ہر طرح کی جنگ کی مخالفت کرتا نظر آتا ہے جبکہ اس کے برعکس عوام الناس کے لیے تو کچھ جنگیں لازم ہوتی ہیں اور بقیہ دوسری جنگیں ضرر رساں ہوتی ہیں۔

ادب میں موجود بے شمار کجیوں میں ایک اور ٹیڑھ بھی موجود رہا ہے؛ ترقی پسندی اور روایت پرستی کی بحث۔......عجیب بحثیں ہیں یہ۔روایت کے ساتھ ''پرستی'' کا لفظ ضرور ملا دیا جاتا ہے۔اس سے ان کا مطلب ہوتا ہے ''پرانا ادب''۔مگر پرانا ادب کہاں ہوتا ہے۔ادب وفن میں جس کو ''پرانا'' کہا جاتا ہے، اس کا ایک حصہ لازمی طور پر ''جدید'' میں شامل ہوتا رہتا ہے۔روایت کی موت تو ادب کی موت ہوتی ہے۔روایت ہمیشہ تخلیقی طور پر افزائش پاتی رہے گی۔کئی لوگ ترقی پسندی وجدیدیت کے جھنڈے تلے روایت سے ہاتھ کھینچ کر اُسے مکمل طور پر ماضی کی تحویل میں دینا چاہتے ہیں۔اور ایسے لوگ کم نہیں، بہت ہیں۔یہ لوگ روایت کی حیاتِ نو سے خائف لوگ ہوتے ہیں۔فیوچرازم یا ماضی شکنی کی روش تو، مجنونانہ اور احمقانہ روش ہوتی ہے۔اصل فریضہ تو حال کو صحت مند ماضی کے امین بنانے کا ہے۔

جب سے مارکیٹ پر جدید کارپوریٹ سیکٹر کا اقتدار قائم ہوگیا تو تب سے یہ اقتدار صرف وہاں تک محدود نہ رہا بلکہ یہ انسانی کمیونٹی تک، ادب اور کلچر تک جا پھیلا۔بین الاقوامی کارپوریٹ اور بین الاقوامی مارکیٹ کا نظریہ اب ادب اور فنون لطیفہ کے ہر شعبے پہ جاری ہے۔ادب کے اندر ''جتنے قاری اتنے متن'' کا نعرہ اُدھر ہی سے تو آیا ہے۔اس نظریے کو ''مابعد جدیدیت'' کہتے ہیں۔یہ نظریہ ایسی گمراہی پھیلاتا ہے کہ گویا دنیا میں غریبی امیری کا جھگڑا بس ختم ہو چکا۔تو پھر، اس طرح سیاست میں سوشلزم اور بورژا جمہوریت کے بیچ تنازعہ بھی ختم ہوگیا۔بس ووٹ والی جمہوریت ہی رہ گئی۔سنجیدگی گئی، فاقہ مستی آگئی۔جب بنیادی مسئلہ ہی نظروں سے اوجھل کر دیا جائے تو پھر سرمایہ دار کے مزے ہی مزے۔اور یہ لطف وسرور ادب کی دنیا میں اُسے ''مابعد جدیدیت'' فراہم کر رہی ہے۔

سچی بات ہے کہ صرف ایسے لوگ ہی مسترد کیے جانے کے قابل نہیں ہیں بلکہ وہ تمام لوگ بھی جنہوں نے ساختیات، پس ساختیات، ڈی کنسٹرکشن، جدیدیت، اور وجودیت جیسی دکانیں بنالی ہیں۔ یہ بہت بڑے کنفیوژن کا باعث ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم انہیں مسترد کرتے ہیں (اور بالکل کرتے ہیں) تو متبادل کیا ہے؟ کیا ادب کے مطالعے کے لیے سماجی و تاریخی تناظر بہت ضروری نہیں ہوتا؟۔ کیا ہر فن پارہ اپنی مخصوص زبان، کلچر اور زمانے کے اندر جنم نہیں لیتا؟ اگر اُس تناظر و پس منظر کو نکال دیا جائے تو مطالعہ ادھورا نہیں رہ جائے گا؟ ہر فن پارہ اپنے زمانے کی سیاسی اور سماجی فکر سے متعلق نہ ہو تو وہ کس کام کا؟ اور خواہ کچھ بھی بولیاں دی جائیں، معاصر رویہ کی جھلک ہر فن پارہ میں موجود ہوتی ہے۔

ایک اور معاملہ مادری قومی زبانوں، ثقافتوں اور تاریخی ورثوں کو بچانے کا ہے۔ آبادی کا ایک طبقہ انگریزی زبان کی عالمگیریت کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا ہے۔ ہم صنعتی پیداوار کرنے والے خطے سے نہیں ہیں۔ ہم تو ان کا استعمال والا سماج ہیں۔ ''اُن'' کا کنزیومر سماج ہیں۔ صنعتی پیداوار انگریزی زبان والے یا اُس سے متاثرہ مما لک میں ہورہی ہے۔ لہٰذا بین الاقوامی پراڈکٹ کی وجہ سے مارکیٹ پر انگریزی زبان کی حاکمیت ہے ۔ گھر کے اندر بھی ،(ریڈیو ٹی وی چھوڑ کر بھی)انگریزی کا راج ہے۔ ہماری اپنی زبانیں سکول اور کالج کی تدریسی زبانیں نہیں ہیں۔ ہم تو بس ڈھاڈری بندوق دیوار پر لٹکا دینے کی حد تک بلوچ رہ گئے ہیں ۔ یا پھر کوئی مصنوعی ''کلچر ڈے'' مخصوص کر کے اپنی ثقافت سے نا آشنا شہری لوگوں کو بلوچی لباس پہنوانے تک محدود ہو چکے ہیں ۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اپنی قومی زبانوں، ثقافتوں کے تحفظ کے لیے کس قدر منظّم محنت کی ضرورت ہے۔

اس سے جڑا ہوا ایک اور اہم سوال اپنی بھرپوریت میں کھڑا ہے۔ بلوچ کی قومی زبان کون سی ہو؟ بلوچ قوم آٹھ زبانیں بطور مادری زبانیں بولتی ہے۔ تو کیا ان آٹھ زبانوں کو لے کر ہر ایک پر شاؤنزم کا کھیل کھیلا جائے؟ یا پھر اس کے بالکل برعکس بلڈوزر لے کر اِن آٹھ زبانوں کو ایک زبان کے سامنے سربسجود کیا جائے؟ اور اگر فیصلہ یہ ہے کہ نہیں، یہ گلدستہ سارے کا سارا برقرار اور

پُر بہار رہے تو ان کے بیچ جمہوری رشتے کس نوعیت کے ہوں؟ ہم میں سے کون ایسا ہے جسے رنگا رنگی کے بدلے یک رنگی قبول ہوگی، مگر اس رنگا رنگی کی برقراری کے لیے بھی تو شعوری اور منظّم کوشش چاہیے ہوتی ہے۔

کلچر کے بارے میں ایک اور نظریاتی سوال موجود ہے۔ کیا کلچر وہی ہے جو مہر گڑھ یا چاکر کے زمانے میں تھا۔ یا انسانی معاشرے میں ارتقا کے ساتھ ساتھ کلچر بھی اپنی بڑھوتری جاری رکھتا ہے ۔ اور اگر کلچر ترقی کرتا جاتا ہے تو کیا وقت کے ساتھ ساتھ غیر ضروری شدہ اور از کار رفتہ خیالات و رویے از خود تبدیل نہیں ہوتے جاتے ہیں؟۔

بے شمار سوالات ہیں جن کے جواب آج کے نوجوان کو چاہئیں، معیشت کے، سماجیات کے فلسفہ کے، سیاست کے، ادب کے، تنظیم کے۔ ایک ''اکیڈمی آف سائنسز'' ہی ایسے تمام سوالات کے جواب مرتب کرسکتی ہے۔ ایسا ادارہ جس کے بہت سے ذیلی شعبے ہوں اور ہر شعبے میں تحقیق ، بحث مباحثہ اور حرکت برکت ہو۔ اور یوں ابھرنے والے سوالات کے جوابات کو کھوجا جا سکتا ہے۔ جہاں حزن، ناکامی اور پشیمانی کو کم، اور حوصلہ، تنظیم اور جہد کو بڑھاوا دینے والوں کو پیدا اور منظّم کیا جا سکتا ہے۔ جہاں ژولیدگی اور افسردگی کی بنیادیں کھودی جا سکتی ہیں اور انسانوں کو خود فیصلہ کرنے کی قوت و بصیرت مہیا کی جا سکتی ہے۔

جن لوگوں نے ابتدا کردی انہیں صد سلام۔ اس کارواں کے معلوم و نامعلوم سپاہیوں نے ایک مدہم و مبہم و نوزائیدہ ستارہ روشن کر دیا تھا۔ اس ''خیال'' کو بہرحال دوام ہے۔ نام و تنظیم کی شکلیں بدلتی رہیں مگر سماج کی اس ضرورت نے اپنے لیے ایک ڈھانچہ قائم رکھنا ہے ۔ چنانچہ بلوچستان میں مڑتے موڑتے، گرتے پڑتے اس کاروان نے ''سنگت اکیڈمی آف سائنسز'' کی شکل اختیار کر لی ۔ گذشتہ پندرہ بیس برسوں سے اس خطے کا روشن فکر ادب اسی نام سے اپنی تنظیمی صورت اپنائے ہوئے ہے۔ اِس کارواں کے سلسلے میں ''سنگت اکیڈمی آف سائنسز'' اب تک کی سب سے طویل عرصہ تک چلنے والی تنظیم ہے۔

آخری اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا اکیڈمی کی ضرورت کے نام پہ اکیڈمی پرستی، تنظیم پرستی

بہت خطرناک بات نہیں ہے؟۔قلم کاروں کی تنظیم میں تو سب سے اولین شرط ''قلم کار'' کی موجودگی ہے، قلم کے استعمال کی ہے۔اگر لکھا ہی کچھ نہ جارہا ہو اور آپ صرف ''تنظیم تنظیم'' کی رٹ لگاتے جائیں تو یہ وقت گزاری کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔کسی اکیڈمک تنظیم کے ارکان کو سب پہلے اکیڈمک کام کرنا ہے، تنظیم کا درجہ دوسرا ہے۔

بلوچستان میں اور بھی بہت سے مکرم ومعزز ادارے موجود ہیں جو ایک ''اکیڈمی آف سائنسز'' سے متعلق کسی نہ کسی شعبے کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ان سب کو اکٹھا کرنا ممکن نہ بھی ہو تو کم ازکم ان کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے اُس شعبے سے متعلق کام انہی کے حوالے کیے جاسکتے ہیں اور اُن کے اخذ کردہ نتائج کو سنجیدہ لیا جاسکتا ہے۔

وسیع بلوچستان، اُس میں رسل ورسائل کی نایابی، آبادی میں کمی، امن وامان کی خراب صورت حال، اور مباحثی ماحول کا عدم وجود، ایک ''اکیڈمی آف سائنسز'' کے لیے کبھی موزوں نہ رہا۔ ایسے میں یہ توقع رکھنا کہ ''سنگت اکیڈمی آف سائنسز'' یورپ کے کسی ملک کی اکیڈمی جیسی ہوگی، غلط ہوگا۔

سنگت اکیڈمی کی ادبی محفلوں اور دانشورانہ مجلسوں جلسوں کی رپورٹوں کے ٹکڑے میں نے زیادہ تر عابد میر کی اُن رپورٹوں سے لیے ہیں جو وہ ماہنامہ سنگت کے لیے (بالخصوص حالیہ سالوں میں) لکھتا رہا۔اسی طرح عزیز بگٹی، شاہین اسماعیل، جیند خان جمالدینی، اکبر ساسولی، سعید کرد، جاوید اختر، اور علی کمیل قزلباش کی رپورٹوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔انہیں جزائے خیر نصیب ہو۔

شاہ محمد مری

6جولائی،2013

سوسال پہلے

بلوچستان میں سیاسی تحریک ہمیشہ سے اس قدر زور، اور قوی رہی کہ یہاں کی ادبی اور دانشورانہ تحریک اس میں دب کر رہ گئی۔یا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کی سیاسی اور ادبی تحریکیں باہم اس قدر پیوست تھیں کہ ان کا جدا کرنا ناممکن ہے۔اور جس طرح اس خطے میں سیاسی تحریک کسی پارٹی یا تنظیم کی صورت متشکل نہ رہی، اسی طرح ادبی تحریک کسی باقاعدہ نام و تنظیم میں صورت گر نہ رہی۔ مقاصد واغراض بہت مختصر اور سادہ تھے لہٰذا ہر فرد اُن پہ قائل تھا۔ایک اتفاق رائے والی سیاست ہوتی تھی جس کا منبع، حکمتِ عملی، داؤ پیچ اور ممکنہ نتائج عام فہم شاعری، حال حوال، بچوں کی کہانیوں اور ضرب الامثال میں بیان و متعین ہوتی تھی۔اور وہ بھی لگے بندھے کہاں ہوتے تھے؟۔اپنے زمانے کو پہچاننا آپ کو اچھی سیاست اور ادب کی طرف لے جاتا ہے۔شعور، ادراک، محبت، بصیرت جیسے مظاہر ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں، ارتقا کی سیڑھیاں چڑھنے کو۔ جینے کی خواہش ہو تو تاریکی سے چھٹکارا پانے کی سعی تو کرنی پڑے گی۔بس یہی دو سچائیاں بلوچ سیاست وادب کا کل بھی قوت متحرکہ تھیں اور آج بھی ہیں۔روشن خیالی البتہ کوئی جامد خصوصیت نہیں ہوتی، اس کا موجود ہونا لازمی ہوتا ہے۔یہ ہر سماج میں اہم اور ہر عہد کی ضرورت رہی ہے۔لیکن اس کی شکل، صورت، سماجی ارتقا کی ہر سیڑھی پر بدل جاتی ہے۔

بلوچ ایک جہدان وفطری بے آرامی والے عوام رہے ہیں۔اُن کے ہاں روٹی روزی کا

حصول بہت سفاک طور پر محنت طلب رہا ہے۔ پھر عزت و وقار کا گلدستہ ہمیشہ دستارِ سر رہا۔ اس کو بچائے رکھنا ہمہ وقت پیش نظر رہا۔ بیرونی حملہ آوروں سے اپنی توقیر و وطن کی حفاظت کرنا ایک مستقل تاریخی جبر رہا۔ اس لیے شروع ہی سے اس کے ادب اور اس کی سیاست میں نہ گلابی محل اور راہداریاں رہیں اور نہ ہی سرمئی ماحول کی چین بھری شامیں تھیں۔

ہر قدیم زبان کی طرح ہمارا ادب بھی آفاقی سچ پہ مبنی شاعری سے شروع ہوا۔ بنی نوعِ انسان کی بھلائی اور اپنے کنبے سے لے کر کُل کائنات کی خیر خواہی ہی اس کا موضوع رہے۔ ان نیک اور خوبصورت افکار کی مضبوط بنیادوں پر ہمارے ادب کی عمارت تعمیر ہوتی گئی۔ خطوں کی باہمی دوری اور رسل و رسائل کی نایابی کے باوجود شاعری ہوا کے کندھوں پر، بہت ہی سادہ موسیقی میں لپٹی ایک کونے سے دوسرے کونے تک نور بکھیرتی رہی۔ تنظیم کی ضرورت تو سماجی ارتقا کے ایک خاص دور میں محسوس ہوتی ہے۔

شہری سیاست اور شہری ادب شہر (گاؤں) کاری کے ساتھ ساتھ ارتقا کرتے گئے۔ اور یوں سیکڑوں برسوں سے چلی آتی سامراج دشمن، انسان دوست اور خیر پرست سیاست و ادب جمہوری اور جدلیاتی طرز پر چلتے رہے۔ ہماری پہلی نظر آنے والی تنظیمی صورت لیے ہوئے ادبی تنظیم 1920 میں موجود اور فنکشنل تھی۔

بلوچی زبان و ادب تحریک

(1920)

بلوچستان میں روشن فکر ادب کی تنظیم کاری کی دھندلی دھندلی شروعات 1920 کے اواخر میں ہونے لگی تھی۔ ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ ہمیں یوسف عزیز مگسی جیسا عوام دوست، سامراج دشمن اور نیک نیت لیڈر عطا ہوا جو کہ خود شاعر، ادیب اور صحافی تھا، اور یوسف عزیز مگسی خوش قسمت کہ اس کو بہت اچھے دوست اور ہم کار مل گئے تھے۔ خواہ ''انجمنِ اتحادِ بلوچاں'' ہو، آل انڈیا بلوچ کانفرنسوں کا انعقاد اور اُن کی تاریخی اساسی قرار دادیں ہوں، اور یا ''فریادِ بلوچستان'' جیسے پمفلٹوں کی اشاعت ہو ....لکھاری انگریز سے آزادی، بلوچستان کے اندر فیوڈل بادشاہت یعنی خانی نظام کے خاتمے اور

مظلوم طبقات کی نجات کی تحریریں لیے ایک دوسرے سے جُڑ رہے تھے۔ یہ سب کے سب بیک وقت سیاسی کارکن بھی تھے، مصلح بھی تھے اور سامراج دشمن بھی۔ کبھی سیاست ادب پر حاوی ہوتی تھی اور کبھی ادب سیاست پہ۔ باہم جُڑ کر انہی لوگوں نے قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی بھی بنائی، ''انجمن وطن'' بھی اور ''بلوچی زبان و ادب تحریک'' بھی۔

کارواں چلتا رہا۔ موت، شناسا چہروں کو معدوم کرتی رہی۔ نئے متبادل چہروں کی آمد ہوتی رہی، کارواں نئے لیڈروں سے شناسائی کرتا گیا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک خیر و نیکی کے پر چارک لوگوں کی تنظیم کا پرچم کبھی بے ہاتھ نہ رہا۔ سوچ اور تنظیم دونوں نکھرتے سنورتے ارتقا کرتے رہے۔ تنظیم عددی اور فکری دونوں اعتبار سے پھلتی پھولتی رہی۔

سال 1949

بلوچستان میں پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن

(بارِ اول)

پاکستان کی تاریخ میں بلوچ کی طرف سے سرکار دشمن پانچ ابھاروں میں سے پہلا ابھار 1948 میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ ایک محدود اور چھوٹا ابھار تھا۔ میر عبدالکریم کی سربراہی میں ریاستِ کلات پہ قبضے کے خلاف لڑائی والا ابھار اس ملک میں قومی سوال کی شدت کا ایک اظہار بنا۔ اس لیے کہ پمفلٹوں، پیغاموں، نعروں، ضرب المثالوں اور اشعار کے ذریعے اس مسلح تحریک کی مدد جاری رہی۔

چنانچہ جب انسان دوست لوگوں نے ایک ادبی تنظیم بنالی تو اُس کے پیچھے یہ بڑا ابھار موجود تھا۔ نئی تنظیم کا نام تھا؛ پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن۔ یہ تنظیم کراچی وغیرہ میں موجود تھی جس کی شاخ اب بلوچستان میں قائم ہوئی۔ آیئے ہم پہلے دیکھیں کہ خود پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن وجود میں کیسے آئی۔

1931 سے قبل سپین میں کسی نے بائیں بازو کے بارے میں شاید سنا بھی نہ ہوگا۔ بلکہ وہاں بھی ''کے جی بی کے ایجنٹ'' غدار، مذہب دشمن نامی فتوؤں ہی کا راج تھا۔ خود لیفٹ بھی کیمونزم کو مسترد کر رہا تھا۔ اور پھر اچانک سب کو ''کچھ'' ہوگیا۔ جب سپین میں فاشزم کی حکمرانی قائم ہوئی اور

جاپان نے چین پر حملہ کر دیا تو سب کو ''کچھ'' ہو گیا۔ یک دم ''آرٹ برائے آرٹ'' کے حامی دانشوروں کو ''کچھ'' ہو گیا اور انھوں نے سیاست، سماج اور انسانیت جیسی کفر کی باتوں کو یک دم گلے لگا لیا اور وہ سارے عناصر فاشزم دشمنی میں کمیونزم کے پرچم تلے یکجا ہونا شروع ہوئے۔ ایک ''انٹرنیشنل بریگیڈ'' بنی اور سپین میں پیپلز آرمی کے شانہ بشانہ اور اس کے تحت فاشزم کے خلاف لڑائی شروع ہوئی۔ پبلو نرودا خانہ جنگی کے زمانے میں سپین میں تھا۔ وہ بریگیڈ کے بارے میں وقتاً فوقتاً براہِ راست معلومات حاصل کرتا۔ ہندوستان کی پیدائش والا انگریز مزاح نگار جارج آرویل وہیں لڑتے ہوئے زخمی ہو گیا۔ ہندوستان کا مُلک راج آنند (حالانکہ گاندھی والا عدم تشددی تھا) نے جنگ میں رضا کار بننے کی پیش کش کر دی۔............سپین کی خانہ جنگی کو ''شاعروں کی جنگ'' کہا جاتا ہے۔

تہذیبی آزادی کے دفاع میں فرانسیسی رائٹرز نے 1935 میں پیرس کے اندر ''انٹرنیشنل کانگریس آف رائٹرز'' منعقد کی۔ اس میں دنیا بھر سے ادیب و شاعر شریک ہوئے۔ مثلاً آندرے زید، ہنری باربوسے، آندرے مالرو، ای ایم فوسٹر، ایلڈوس ہکسلے، رالف فاکس، مادام صوفیہ وادیا۔ اور اس میں میکسم گورکی بوجوہ شریک نہ ہو سکا۔

فاشزم کے خلاف اور سپین کی خانہ جنگی کے دوران آزادی و ثقافت کے دفاع میں رالف فاکس، کرسٹوفر کاڈویل اور روبرٹ جان کارنفورڈ نے اپنی جانوں کے نذرانے دیے۔ دانشوروں کی دنیا میں ہلچل آ گئی۔ فاشزم دشمنی نے قلم، برش، گٹار اور رقص کو سماجی ابتری، طبقاتی فرق اور ملاؤں کے خلاف صف آرا کر دیا۔ اظہار کو آسان کر کے عام آدمی کی تفہیم کے قابل بنا دیا گیا اور عام آدمی اور دانشور ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ایک جیسی سوچ قائم ہو گئی۔

پیرس کانگریس نے گویا منشور مہیا کر دیا: ''ہم فاشزم کے خلاف ہیں، ہم جنگ کے خلاف ہیں، ہم سوویت یونین کے طرفدار ہیں، ہم مزدور طبقہ کے حق میں ہیں، سوشلزم کے حق میں ہیں، آزادی کے ساتھی ہیں''۔

ادیبوں کے نام جو اپیل جاری کی گئی اس میں تمام قلم کاروں سے یوں گزارش کی گئی:

''رفیقانِ قلم! موت کے خلاف زندگی کا ساتھ دو۔ ہمارا قلم، ہمارا فن، ہمارا علم ان قوتوں کے خلاف رکنے نہ پائے جو موت کو دعوت دیتی ہیں، جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں، جو روپے کے بل پر حکومت کرتی

ہیں، جو کارخانہ داروں اور زبردستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور بالآخر فاشزم کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی وہ طاقتیں ہیں جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں''۔

پھر 1935 میں لندن کے ایک اجتماع میں ''انڈین پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن'' کی داغ بیل ڈالی گئی۔

ترقی پسند ادب اور ترقی پسند تحریک میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر (بلوچی زبان میں بالخصوص) ہر وقت موجود رہا ہے۔ جبکہ اس فکر کی تنظیمی صورت گری بہت بعد میں ہوئی۔ ہمارے ہاں اِس تحریک میں کچھ سیاسی عنصر اس لیے شامل ہو گیا کہ وہ حالات کا تقاضا تھا۔ انگریز کے خلاف لڑائی، معاشی عدل و انصاف کی جدوجہد، اور دبے ہوئے طبقے کے مسائل سامنے لائے گئے۔

بلوچستان میں پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی شاخ 1949 میں قائم ہوئی۔ اس میں وہی لوگ شامل تھے جو مختلف تنظیمی ناموں سے عوامی ادبی کاروان کو جاری و ساری رکھے ہوئے تھے۔ اس میں کامل القادری، رفیق راز، انجم قزلباش، عابد شاہ اور ع۔ سلام شامل تھے۔ (بحوالہ، کرینبروک، جی فلپ اور مرز ولف یولرچ۔ اورل لٹریچر آف ایرانین لینگوئجز۔ Tauris۔ لندن۔ صفحہ 197)

ایک اور جگہ پر یہ نام یوں ہیں: کامل القادری، ع۔ سلام، انجم قزلباش، میر گل خان نصیر، رفیق راز، آزاد جمالدینی۔ اِس غیر تصدیق شدہ ذریعے کے مطابق انجم قزلباش اس کا صوبائی سیکریٹری تھا۔

سال1950

بلوچی زبان و ادبہ دیوان

کمال خان شیرانی، ڈاکٹر خدائیداد اور عبداللہ جان جمالدینی اس تنظیم کے فعال لوگ تھے۔ جذبات اور آئیڈیلزم اپنی جگہ، مگر جغرافیائی خطے تو خود اپنی خصوصیات اور خصلتیں رکھتے ہیں۔ بلوچستان خود اپنے رنگ و بو میں مدغم کیے بغیر الفاظ، اصطلاحات اور نظریات کی نقل خوری کو کبھی اچھا نہیں سمجھتا۔ لہٰذا تنظیم کے مافیہ کی سلامتی کے لیے معروض نے اس کی ہیئت کی تبدیلی کا حکم دیا اور تب یہیں لٹ خانہ میں خدائیداد کے ذریعے ''پشتو ٹولی'' بنی اور 1950 ہی میں عبداللہ جان نے ''بلوچی زبان و ادبہ

دیوان'' قائم کیا۔ یہ تنظیم کوئٹہ میں بنی۔ بلوچستان کا رنگ لیے اب تنظیم، اپنی جڑیں گہری اور توانا کرتی چلی گئی۔ گل خان نہ صرف اس ادبی انجمن کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھا بلکہ وہ اس کا اولین صدر بھی منتخب ہوگیا۔ اسی تنظیم نے اس کی شاعری کا اور خود بلوچ شاعری کا اولین مجموعہ ''گلبانگ'' شائع کیا۔ اس تنظیم کا نائب صدر غلام جان شاہوانی تھا اور جنرل سیکرٹری عبداللہ جان جمالدینی۔ بابو عبدالکریم شورش پریس سیکرٹری، قاضی غلام محی الدین خزانچی، انور عالیانی جوائنٹ سیکرٹری تھا اور آزاد جمالدینی تو ساتھ تھا ہی۔ یہ تنظیم اپنی ڈھیلی ڈھالی صورت میں 1953 تک چلتی رہی۔ پھر اُس کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو آئندہ اِس فکر کی تنظیموں کے ساتھ ہوتا رہا۔ کوئی ایک سال جیا، کوئی دو سال۔ مگر ان لوگوں کی شروع کردہ ادبی تحریک کسی نہ کسی شکل میں جاری وساری رہی۔

دوسری بار پر اگر یسو رائٹر زایسوسی ایشن

ادبی تحریک کے اگلے دور کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب کچھ نائب تحصیلداروں نے نوکریاں چھوڑ دیں اور ایک کتابوں کی دکان ''فی الحال سٹیشنری مارٹ'' کے نام سے شروع کی۔ اُن کا گھر یعنی "لٹ خانہ" اور اُن کی دکان وہ اولین منظّم کوشش تھی جن کے تحت ادب کے الگ شعبے کے بطور، عوام الناس اور اس کی سیاست کی راہنمائی مقصود تھی۔ مقصد یہ تھا کہ سیاست وادب کے شعبے الگ الگ یک فکری میں نشوونما پاتے رہیں۔ نہ صرف خود اپنی راہ سیدھی رکھی جائے بلکہ اور لوگوں کو بھی اس طرف راغب کیا جائے، شامل کیا جائے اور اس طرح ایک بڑی تحریک کی بنیاد رکھی جائے۔ اور یہ واقعی ایک اچھی خاصی بڑی اور نسبتاً دیر تک چلنے والی کوشش تھی۔ ملک کے دیگر حصوں میں قائم ''پراگریسو رائٹرز ایسو سی ایشن'' کے اِن سے روابط ہوئے اور انہی دوستوں نے اس تنظیم کی شاخ قائم کر کے خود کو اس تنظیم میں غرق کر دیا۔

1950 کی دَہائی کے اوائل برسوں میں سجاد ظہیر بلوچستان میں مچھ جیل میں قید تھا۔ وہ پیشیوں پر کوئٹہ لایا جاتا تھا۔ اور درمیان میں وقفوں وقفوں سے ضمانت پر رہائی بھی ملتی تھی۔ ان سارے اوقات میں لٹ خانے والوں نے اس کی مہمانی اور رفاقت کی۔ اس عمل نے بھی یہاں ترقی پسند رائٹرز کی باہمی قربت اور جڑت کو استوار کیا۔

PWA کی دو تین سال تک کچھ سرگرمیاں رہیں۔ اس کا دفتر بھی فاطمہ جناح روڈ پر قائم ہوا۔ مگر ریاستی سخت کنٹرول والے علاقوں میں جنم لینے والے PWA پر پابندی لگا دی گئی اور ہمارے بلوچستان کی برانچ بھی آٹومیٹک انداز میں اِس کے ساتھ ہی پابندی کا شکار ہوگئی۔

دیماروو خیں اولس

غلام محمد شاہوانی اپنے نیم ادبی نیم سیاسی رسالے ''نوائے وطن'' کے ساتھ، آزاد جمالدینی تقریباً مکمل ادبی رسالے ''بلوچی'' کے ساتھ، اور عبداللہ جان جمالدینی اپنی ترقی پسند سیاسی ادبی تنظیم ''دیماروو خیں اولس'' کے ساتھ حرف وفکر کی آبیاری کرتے رہے۔

واضح رہے کہ ''دیماروو خیں اولس'' قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی پر پابندی لگنے کے بعد شروع کی گئی جس میں بابو عبدالرحمٰن کرد بھی شامل تھا۔............ بے شمار نام ہیں جو اس قربت کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ میر گل خان نصیر بلوچی کا ملک الشعرا بنا۔ اس نے انگریز سامراج سے نجات، سرداری نظام کے خاتمے اور ایک مترقی سماج کے قیام پر مشتمل اردو، بلوچی اور فارسی میں زبردست شاعری کی۔

سال 1967

عوامی ادبی انجمن

1954 میں پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن پر پابندی لگ گئی تو اس کے متبادل ملک گیر تنظیم بنانے کی از حد ضرورت محسوس ہونے لگی۔ مگر یہاں 1958 میں بلوچستان کی دوسرا جمہوری عوامی ابھار شروع ہوا۔ 1964 اور 1966 کو تیسری لڑائی چھڑی۔ ادب، شاعری سب کی سب اورل ہوتی رہی۔ عوامی تحریری ادب اور ادبی تنظیمیں جڑیں نہ بنا سکیں۔ وہ تو 1967 میں جا کر ''عوامی ادبی انجمن'' قائم کی گئی۔ محترم نور محمد شیخ نے مجھے منشور کی وہی کاپی بھیج دی جس میں اسی ایک کتابچے پر یہ منشور اردو، بنگالی، بلوچی، سندھی، پشتو اور پنجابی زبانوں میں چھپا ہوا ہے۔ اور اس کے چھپنے کے بعد اس کے پہلے صفحے پر فیضؔ، گل خانؔ، حسن حمیدی، حسان، عنایت کاشمیری، شیخ ایاز، اجمل خٹک اور ابراہیم جویو نے اپنے دستخط کر دیے تھے۔ (اوریجنل کاپی ہے میرے پاس) اس تنظیم کے منشور پر اولین دستخط گل خان

کے تھے، اور منشور کا بلوچی ترجمہ بھی گل خان کا ہے۔

چونکہ وہ ایک باضابطہ اور مرتب شدہ دستاویز ہے اس لیے ہم اسے یہاں شائع کر رہے ہیں۔

عوامی ادبی انجمن کا منشور

''اِن دنوں ہمارا معاشرہ بڑی آزمائشوں سے گزر رہا ہے۔ پاکستان کو وجود میں آئے بیس برس ہو چکے، لیکن سماجی زندگی کا رخ ابھی متعین نہیں ہوا ہے، اور نہ جہدِ حیات کی راہیں واضح ہوئی ہیں۔ لوگوں کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار نصیب نہیں ہوا ہے۔ زبان اور قلم پر طرح طرح کی پابندیاں لگی ہوئی ہیں۔ اِس کی وجہ سے ہر طرف بے چینی اور مایوسی پھیلی ہوئی ہے۔ ادب اور فن کی تخلیق کرنے والا طبقہ، جس کا فرض عوام کی رہنمائی کرنا تھا، خود ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہے، اور اس میں بعض ایسے رجحانات ابھر رہے ہیں جو ادب اور معاشرہ دونوں کے لیے مضر ہیں۔

''بعض اہلِ قلم زندگی ہی کو مہمل اور بے معنی سمجھنے لگے ہیں، بعض ادیب اپنے تجربے مشاہدے اور مطالعے کے بارے میں سائنسی نقطہ نظر اختیار کرنے کی بجائے توہم پرستی کو ہوا دے رہے ہیں، بعض قدامت پرستی اور اندھا دھند تقلید کی تبلیغ کرتے ہیں اور تنقید اور اجتہاد اور نئے تجربوں سے گریز کرتے ہیں اور بعض حضرات ہیئت کے تجریدی تجربوں میں مصروف ہیں اور نئی تحقیق کی ماہیئت اور معنویت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، اور بعض ادیب شدید داخلیت اور فراریت کا شکار ہیں۔ غرض یہ کہ ان ادیبوں کی نگارشات انسان کے مسائلِ زیست کے احساس سے خالی ہوتی جاتی ہیں۔

''ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ادیب اور دانشور اور فن کار معاشرے کا ضمیر اور سماج کے حساس اور باشعور عناصر ہوتے ہیں اس لیے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اپنی تخلیقات کے ذریعے سے اپنے معاشرے اور عام انسانی سماج کی بہتری اور ترقی میں مدد دینا ہمارا ایک سماجی اور اخلاقی فرض ہے۔ ہم اس کا شعوری احساس رکھتے ہیں کہ ادیب بھی دوسرے شہریوں کی طرح اجتماعی زندگی کا ایک فعال حصہ ہوتے ہیں۔ اپنے فرض کا یہ احساس ہمارے اس ادبی نقطۂ نظر کی دین ہے کہ سارا ادب حقیقت میں سماجی زندگی کی پیداوار ہوتا ہے؛ اور ایک صحیح اور صحت مند ادب زندگی کی عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ اس کا معمار اور رہنما بھی ہوتا ہے۔ زندگی کی تنقید کرنا اس کا حق ہے، اور سائنسی اور عقلی بنیادوں پر اس کی تبدیلی میں مدد دینا اس کا فرض ہے۔

''یہ نقطۂ نظر ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ وہ سماجی حقیقت جس کو سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا اور جس کے بدلنے میں دوسروں کے ساتھ مل کر حصہ لینا، ادیب کا اخلاقی فرض ہے، وہ حقیقت اپنی ذات میں ایک اکائی ہے، جو معیشت، سیاست اور تہذیب کے الگ الگ خانوں میں نہیں بٹ سکتی۔ اس لیے فن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے زندگی کے معاشی، سیاسی اور تہذیبی پہلوؤں کی عکاسی اور تنقید کرنا ایک سچے اور صحیح ادب کا کام ہے۔

''یہ کام جو ہم پاکستانی ادیبوں کو انجام دینا ہے ماضی میں بھی ہمارے ملک کے ادیبوں اور فن کاروں نے انجام دیا تھا جن سے ہمیں ادب اور فنونِ لطیفہ کا بڑا گراں مایہ خزانہ ورثہ میں ملا ہے۔ اردو اور قومی زبانوں میں جو عظیم ادبی سرمایہ موجود ہے، ہم اپنے آپ کو اس کا محافظ اور امین تصور کرتے ہیں۔ لیکن آنکھ بند کر کے ماضی کی مدح خوانی کرنے کی بجائے ہم ان بزرگوں کی نئی تخلیقات اور فکری رجحانات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور ان کی انسان دوستی، حق گوئی، انصاف پسندی، صلح جوئی اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی جمالیاتی قدروں کو اپناتے ہیں۔

''حالیہ زمانے میں بھی ہمارے ادیبوں اور فن کاروں نے جمہوریت کی ترقی اور فکر و خیال کی آزادی کی جدوجہد میں جو عظیم خدمات انجام دی ہیں، انہیں بھی ہم اپنا ورثہ سمجھتے ہیں۔ ہم بھی آج اپنے قلم کے ذریعے سے وہی خدمات انجام دینے کے لیے اپنے ملک میں شہری آزادیوں کی بحالی ضروری سمجھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی اشاعت پر سے ناروا پابندیاں اٹھالی جائیں۔

''ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ شہری آزادیوں کی بحالی کا مسئلہ ادیب اور عوام دونوں کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ جب عوام کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اپنے تجربے کی روشنی میں آزادی کے ساتھ اپنی اجتماعی ترقی کا راستہ ڈھونڈیں اور آزادی سے اس راستہ پر چلیں تو سماج میں وہ تخلیقی قوتیں پنپتی ہیں جن سے ہماری تخلیقی صلاحیتوں کو تحریک ہوتی ہے اور جن کی فن کارانہ ترجمانی سے ہماری کاوشیں نئی تخلیق بن جاتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ادیبوں کو بھی اپنے ضمیر اور فکر کے مطابق لکھنے اور بولنے کی بھرپور آزادی حاصل ہو تو ہم اپنی سماجی زندگی کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں اور اپنی ادبی تخلیقات کی مدد سے زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے میں حصہ لے سکتے ہیں۔

’’ہمارے نزدیک اس جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے، وہ حالات پیدا کیے جائیں کہ سب قومیں، ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر اور تسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں۔ اس لیے ہم ادیب تمام قوموں کے لیے یکساں داخلی خود مختاری، ان کی زبانوں کے لیے تعلیم، دفتر اور ملازمتوں کے مقابلوں کی زبان بننے کا حق چاہتے ہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے گذشتہ غیر ملکی آقاؤں کی بدیسی زبان ......انگریزی......کو ہماری درس گاہوں اور دفتروں سے نکالا جائے اور اردو سے مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں کے درمیان ایک مشترکہ زبان کا کام لیا جائے۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں اور تمام شہری بلا امتیازِ نسل و رنگ و مذہب آپس میں مساوی ہیں اور پاکستان کے ہر علاقے کے باشندوں کو سماجی، سیاسی اور تہذیبی ترقی کا پورا پورا حق ہے۔

’’ہمارے عوام کی مادی خوش حالی اور تہذیبی ترقی کے لیے جو اِن جمہوری اور شہری آزادیوں کا مقصد ہے، ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ مروجہ تعلیمی نظام کو، جسے غیر ملکی آقاؤں نے اپنے سامراجی مقاصد کی خاطر ہم پر مسلط کیا تھا، ملک کے سماجی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے اور سائنسی اور عقلی بنیادوں پر نئے سرے سے ترتیب دیا جائے، تعلیم کو عام اور ارزاں کیا جائے اور درس گاہوں کا معیار اونچا کیا جائے۔

’’مگر ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہماری سماجی اور تہذیبی ترقی میں ملک کے اندرونی حالات اور عالمی سامراج کے اتحاد نے سخت رکاوٹیں پیدا کر رکھی ہیں۔ عالمی سامراج کی جارحانہ کارروائیوں نے، جس کا سب سے بڑا سہارا امریکی سامراج ہے، عالمی امن کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ امریکی سامراج نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں جبری مداخلت کر کے آزادی اور جمہوریت کی قوتوں کو جس طرح پامال کیا ہے، وہ سب پر آشکارا ہے اور خود ہماری آزادی، معیشت، معاشرت، اخلاق، تہذیب اور انداز فکر پر امریکی سامراج سے وابستگی کی وجہ سے جو مضر اثرات پڑ رہے ہیں، وہ ہم روز دیکھتے ہیں اور اس نے ہمارے ملک میں جاگیرداری کی باقیات کو جو سہارا دے رکھا ہے، جس کے اثر سے ہماری معیشت، سیاست، تہذیب اور ادب میں جو سماج دشمن اور غیر صحت مند رجحانات ابھرتے رہتے ہیں، اسے ہم روز محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے ہم اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اپنی تحریروں کے ذریعے

سے سامراجی قوتوں کا مقابلہ کریں اور ان کے اثر سے ہماری سیاست، سماج اور ادب میں جو انسانیت دشمن عوامل کارفرما ہیں، ان سے نبرد آزما ہوں اور عالمی سامراج کی امن شکن کارروائیوں کی مخالفت کریں۔

’’ہمارا عقیدہ ہے کہ انسان کی بقا اور ترقی کا انحصار عالمی امن پر ہے، اور علم و ادب اور فکر و فن کے پودے جنگ کے زہریلے ماحول میں بارآور نہیں ہو سکتے۔ ہماری رائے میں دنیا کے تمام نزاعی مسائل خواہ وہ سیاسی اور معاشی ہوں یا انسانی اور تہذیبی ہوں باہمی گفت و شنید کے ذریعے سے حل ہو سکتے ہیں۔ ملکوں اور قوموں کو باہمی منافرت اور جنگ پر اکسانے والوں کو ہم امن کا دشمن سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہم انسان کو انسان سے قریب لانے کی اور ملکوں کے درمیان مفاہمت اور دوستی بڑھانے کی تمام کوششوں کا خیر مقدم کرتے ہیں، بشرطیکہ کوششیں آزادی، جمہوریت اور قوموں کے حق خود ارادیت کے اصول پر مبنی ہوں۔

’’ہم ادیبوں کا مسلک صحت مند اور زندہ ادب تخلیق کرنا ہے، ایسا ادب جو دل کی گہرائیوں سے نکلے اور فن کے معیارِ جمال پر پورا اترے، ایسا ادب جو حسن و محبت کی نغمگی، عشق و یقین کے سوز اور حق و صداقت کے خلوص سے لبریز ہو، ایسا ادب جو زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ ہو اور جو لوگوں کو جگائے، آگے بڑھائے، تسکین دے اور خوش کرے۔

’’لیکن ہم یہ خوب جانتے ہیں کہ ایسے انسانیت دوست ادب کی تخلیق کے لیے سازگار حالات پیدا کرنے کی جدوجہد ادیبوں کی متفرق اور انفرادی کوششوں سے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چونکہ انسانیت دشمن قوتیں منظّم اور متحد ہیں اور اپنی سرپرستی میں ادیبوں کی تنظیمیں قائم کر کے انہیں اپنے زور، اور زر سے گم راہ کرتی ہیں اس لیے ہم ادیبوں کو بھی منظّم اور متحد ہو کر ان کے خلاف جدوجہد کرنا ہوگی تاکہ ادیب اور ادب کو ان کے مضر اثر سے بچایا جائے۔

’’چنانچہ اس غرض سے ہم اپنی ادبی تنظیم ....’’عوامی ادبی انجمن‘‘ .... کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی تمام زبانوں کے ادیبوں کی انجمن ہے جو انسان دوست اور صحت مند ادب کی تخلیق کو اپنا فرض سمجھتے ہیں‘‘۔

آپسی نشستوں، بحثوں، قراردادوں کے نتیجے میں یہ بہت پاک لوگ نسلوں کی تربیت کرتے

رہے۔ ر، حسان اس کا پہلا جنرل سیکریٹری تھا۔ نور محمد شیخ آج بھی اس نیم جان تنظیم کو اپنے کندھوں پہ اٹھائے پھرتا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ وہ اپنی بے پناہ کمٹ منٹ سے اسے چلا رہا ہے، اس کی تنقیدی نشستیں منعقد کراتا ہے۔ اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔

سال1986

پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن

(بارسوم)

پاکستانی سیاست کے عمومی ہچکولوں کی زد میں ہماری ادبی تحریک بھی رہی۔ ہماری سیٹوئی سنٹوئی سرکار نے متبادل نہ بننے دینے اور صرف شیطان کی خدائی کی چوکیداری کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ گرفتاریاں، پابندیاں ہمارے زعما کی گویا تقدیر تھی۔ تنظیم نام بدلتی رہی، ابھی ڈوبی ابھی ابھری۔ پاکستانی سیاہ رجعتی حکمرانوں نے ہمارے ہر شعبہِ زندگی کو لامتناہی درد کے کرب میں ڈالے رکھا۔

کراچی میں منعقدہ پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی گولڈن جوبلی میں بلوچستان کا مضبوط وفد شریک ہوا۔ 1986 میں ایک بار پھر بلوچستان میں پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کا قافلہ مرتب ہوگیا۔ ایک کنوینگ کمیٹی بنالی گئی، کچھ ماہ تک ادبی نشستیں منعقد ہوتی رہیں، مگر بات چلی نہیں۔ اور یہ تنظیم ایک بار پھر غیر فعال ہوگئی۔

مگر فطرت کو خلا ہرگز ہرگز قبول نہیں۔ معاشرے کے غیر فعال ہونے سے رواں فطرت میں خلا پیدا ہوتا ہے۔ سرگرمی کی غیر موجودگی میں فطرت کے آفاقی قوانین کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ لہٰذا ابدی قانون ہے کہ انسانی سرگرمی، حرکت اور ہل چل جاری رہتی ہے۔ ادبی تنظیم تو اس حرکت وسرگرمی کی ساتھی ہوتی ہے۔ چنانچہ مقامی ناموں، مقامی رنگ و بو اور مقامی خصلتیں لی ہوئی ادبی تنظیمیں بلوچستان کے سیاسی سماجی گراف کے ساتھ ساتھ ابھرتی رہیں۔

سال1989

لوز چیذغ

پروگریسو رائٹرز ایسوسیشن کے احیا کی کوشش ایک بار پھر دم توڑ گئی تو ایک نئی صورت سے کام کرنے کے بارے میں بحثیں شروع ہوئیں۔ مختلف ناموں پر غور ہوا، پروگرام کے بارے میں بحثیں ہوئیں اور مجوزہ ناموں کے اہداف اور منزل متعین کرنے کے بارے میں سرگرم تبادلہِ خیالات ہوئے۔ ان تمام مراحل سے گزر کر ایک نئی تنظیم بنی جس کا احوال ہم ماہنامہ نوکیں دور کے 1990 کے جنوری، فروری کے شمارے میں شائع شدہ اُس رپورٹ کی صورت میں دیں گے جو تنظیم کے اولین سیکرٹری جنرل شاہ محمد مری کے نام سے چھپی؛

'' 13 اگست 1989 کو بالآخر اس پرانے اور دھندلے ہدف کی تکمیل ہوئی جو بلوچ تعلیم یافتہ احباب اور دانشوروں نے بلوچی زبان وادب کی ترقی اور خدمت وخیالداری کے لیے ایک تنظیم بنانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ اس تنظیم کا نام ''لوز چیذغ'' رکھا گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ اس تنظیم کی سالگرہ گیارہ اگست کو رکھی جائے۔ یہ فیصلہ میر غوث بخش بزنجو کے فکر کی Rationality کو تسلیم کرنے کا ایک نشان ہے۔ یہ تنظیم دراصل ایک ''اکیڈمی آف سائنسز'' کی منزل تک پہنچنے کا اولین قدم ہے۔ اور جوں جوں اس کے مالی، نفری اور ذہنی وسائل بڑھتے جائیں گے، اس تنظیم کا نام اور میدانِ کار بھی وسعت پاتے رہیں گے۔ اس وقت تنظیم اپنے لیے کام کے مندرجہ ذیل پہلو منتخب کرتی ہے:

1۔ ابھی تک تحریر میں نہ آئی ہوئی شاعری، ضرب الامثال، پہیلی، لوک کہانیوں وغیرہ کا اکٹھا کرنا، چھاننا اور شائع کرنا۔ سائنس وسوشل سائنسز کی مختلف شاخوں میں تحقیق کا شوق پیدا کرنا اور انہیں شائع کرنے کا بندوبست کرنا۔

2۔ بلوچی زبان وادب کے بارے میں تحقیق کرنا۔

3۔ دوسری زبانوں کے ادب کو بلوچی میں ترجمہ کرنا۔

4۔ مکمل اور نمائندہ ڈکشنری بنانا۔

5۔ بلوچی زبان و ادب کی ترقی کے بارے میں سیمینارز، تنقیدی نشستیں، مشاعرے، ورکشاپس اور سٹڈی سرکلوں کا بندوبست کرنا۔

6۔ ملکی وبین الاقوامی ادبی وتحقیقی تنظیموں سے رابطہ کرنا۔

7۔بلوچ قوم کے اندر پڑھنے لکھنے (خاص کر بلوچی میں) کا شوق اور جذبہ پیدا کرنا۔

8۔وسائل کے میسر آنے پر اخبار، رسالہ اور جرائد کی اشاعت کا بندوبست کرنا۔

9۔بلوچی زبان وادب کی مکمل تاریخ مرمت کرنا اور چھاپنا۔

10۔بلوچی زبان ، ادب اور ثقافت کے لیے ایک بڑا ریسرچ سنٹر قائم کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرنا۔

11۔اس تنظیم کو''اکیڈمی آف سائنسز'' کی منزل تک لے کر جانا۔

تنظیم نے اپنی عبوری کابینہ یوں بنائی:

سرپرست اعلیٰ: عبداللہ جمالدینی۔صدر: سلطان نعیم قیصرانی ۔سینئر نائب صدر و خازن: صبا دشتیاری ۔سیکرٹری جنرل: شاہ محمد مری۔ جوائنٹ سیکرٹری: اللہ بخش بزدار۔پریس سیکرٹری:جیئند جمالدینی۔

دوسری میٹنگ

اجلاس نے پہلی میٹنگ کی کاروائی کی منظوری دی۔

''یہ میٹنگ دراصل آئین ساز کمیٹی کی تھی۔آئین کے مسودے پر طویل اور سنجیدہ بحث کی گئی۔بہت ساری ترامیم کے بعد بالآخر آئین منظور ہوا۔اس کے فیئر کرنے کے لیے دس بارہ دن دیے گئے۔جس کے بعد اسے 1000 کی تعداد میں چھاپنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔مونوگرام اور ممبر شپ فارم وضع کرنے کا فیصلہ بھی ہوا۔

اسی زمانے میں 1990 میں ماہنامہ نوکیں دور، دوبارہ چھپنا شروع ہوگیا۔سارے روشن فکر دوست اپنے اس ترجمان رسالے کے گرد جمع ہونا شروع ہوگئے۔آئین کی منظوری کے بعد تنظیم نہایت فعال انداز میں کام کرنے لگی۔

اُسی دوران 1990 کے اوائل میں پاکستان بھر سے ملاؤں نے مل کر مکران میں ذکری بلوچوں پہ حملوں کا آغاز کردیا۔ملاّ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوئے۔انہوں نے جلسہ کرنے کے بہانے لشکرکشی کرکے ذکری فرقے کے مسلمانوں پر حملہ کردیا جو اپنے تہوار پہ جمع تھے۔تقریباً نصف درجن بلوچ ہلاک ہوگئے جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔مذہبی فرقہ واریت کے نام پہ پسماندہ بلوچوں پہ ایک اور

جنگ مسلط کرنے کی اسی سازش کے خلاف بلوچستان بھر کے ادیب ڈٹ گئے۔لوز چیذ غ کے دوستوں نے بالخصوص اس خطرناک عمل کو شدت سے محسوس کیا۔''نوکیں دور'' میں مضامین، اداریے لکھے،لوگوں سے بڑے پیمانے پر رابطے کیے اور پاکستان بھر کے مترقی لوگوں کو متحرک کیا۔اس سلسلے میں لوز چیذ غ کی پہل کاری پہ بلوچستان بھر سے نمائندہ ادیبوں،صحافیوں اور دانشوروں کی ایک میٹنگ ہوئی۔شاہ محمد مری کی لکھی اس میٹنگ کی روداد ماہنامہ نوکیں دور کے مارچ، اپریل 1990 کے شمارے کے بیک ٹائٹل پر''احتجاج'' کے عنوان سے چھپی، جو یوں ہے؛

''اپریل 1990 میں بلوچستان کے اہل قلم، دانشوروں اور صحافیوں کی ایک ہنگامی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں مکران میں حالیہ ناخوشگوار واقعہ پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا گیا کہ ملک کے آئین کے حوالے سے ہر قوم اور ہر طبقے کے لوگوں کو اپنے عقیدے اور مسلک کے مطابق زندہ رہنے اور عبادت کرنے کے حقوق حاصل ہیں۔کسی شخص یا طبقے کو اس میں مداخلت کرنے اور اپنے استصواب کے استعمال کے لیے مجبور کرنے کا اختیار نہیں۔

''اجلاس میں اس امر پر گہرے افسوس کا اظہار کیا گیا کہ عوامی حقوق کے اس مسلمہ دور میں ایک رجعت پسند اور کوتاہ اندیش فکر کی جانب سے پاکستان کے پرامن ترین صوبہ میں نہ صرف امن و امان کو تہہ و بالا کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ بے گناہ اور قیمتی جانوں کے اتلاف کے ساتھ ساتھ عوام میں خوف و دہشت اور مخاصمتوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی حمایت کوئی بھی ہوش منداور انسان دوست شخص نہیں کرسکتا۔

''بلوچستان کے اہل قلم اور دانشوروں کا اجلاس اپنی اس رائے کا برملا اظہار کرتا ہے کہ اکیسویں صدی میں دنیا جبکہ جہالت، تنگ دلی، تسلط پسندی، تعصب اور منافرت سے پاک ہورہی ہے اور بین الاقوامی انسانی رہنما اصول اپنا کر قریب سے قریب تر ہورہی ہے ، جہاں زبان ، رنگ ، نسل ، مذہب اور عقائد سب انسانی عظمت میں ضم ہورہے ہیں وہاں بلوچوں کی یکجہتی کو کمزور کرنے کے لیے چند تنگ نظر، متعصب اور رجعت پرستوں نے جو عمل کیا ہے، اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔

''ہم ملک بھر کے اہل قلم ، دانشوروں ، صحافیوں ، سیاستدانوں اور ترقی پسندوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس صورت حال کا صحیح ادراک کرتے ہوئے ہر قسم کی بنیاد پرستی کی نہ صرف مذمت

کریں بلکہ آئندہ ایسے اقدامات سے رجعت پسندوں کو روکنے کے لیے رائے عامہ کو بھی بیدار کریں تاکہ اس قسم کی انسان دشمن سرگرمیوں کا اعادہ نہ ہو۔ جبر واستبداد کے حامیوں اور جمہوریت دشمنوں کی طرف سے آئے دن رنگ ونسل، زبان مذہب اور عقیدہ یا جنس کے نام پر انسانی لہو کی ارزانی کی صورت میں روا رکھا جا رہا ہے۔

اجلاس میں ماہنامہ بہار گاہ کراچی، ماہنامہ بلوچی کوئٹہ، ہفتہ روزہ زمانہ بلوچی کوئٹہ، ماہنامہ نوکیں دور کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ارکان کے علاوہ اہل قلم کی بھاری تعداد نے شرکت کی۔ اس سلسلے میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لیے ایک دستخطی مہم جلد شروع کی جائے گی''۔

لوز چیذغ کیا ہے؟

''لوز چیذ غ'' کے معانی اور سیاق و اسباق کے لیے بہتر ہے کہ ہم پشاور کے جناب فضل ربی درد کے مضمون ''چیذ غ......دھواں'' سے مدد لیں جو اس نے 1991 کے اوائل میں بلوچستان کے سفر کے بعد جا کر لکھا تھا اور جو ماہنامہ نوکیں دور کے مارچ اپریل 1991 کے شمارے میں (صفحہ 23-24) پہ شائع ہوا؛

''......وہاں ہم نے ایک بہت ہی مخصوص چیز نوٹ کی جس کو بلوچ ''چیذ غ'' کہتے ہیں۔ چیذ غ کو آپ مینار کے معانی میں سمجھ لیں کیونکہ یہ پتھر سے بنا ہوا چھوٹا سا مینار ہوتا ہے اور یہ مینار کسی اہم واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے یا اس کی یاد تازہ کرتا ہے۔ یہ مینار بلوچستان کے شجاع اور بہادر عوام کے کارناموں، حب الوطنی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان میں اکثر مینار بلوچستان پر حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے والے شہیدوں کے ہیں...... یہ چیذ غ بلوچستان کی تاریخ کی شجاعت اور بہادری کے تسلسل کو قائم و دائم رکھے گا۔ ہم نے ان چیذغوں کو سلام کیا۔

''......بہر حال جب ہم کوئٹہ پہنچے تو یہ چیذ غ ہمیں کوئٹہ میں ملا۔ کوئٹہ کا چیذ غ مادی کے بجائے روحانی تھا۔ یہاں بلوچ دانشوروں نے ایک تنظیم ''لوز چیذ غ'' کے نام سے بنائی ہے۔ ''لوز چیذ غ' کے معنی ہیں ''مینارِ لفظ''۔ اس تنظیم کے سیکرٹری جنرل پروفیسر ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب ہیں۔ ڈاکٹر مری صاحب بلوچی ادب وثقافت کی نوک پلک سنوارنے میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ ڈاکٹر مری صاحب کے توسط سے ہماری ملاقات ایک نوجوان بلوچ ادیب وشاعر صبا دشتیاری صاحب سے

ہوئی جو بلوچی شاعری اور ادب کو نئی جہت دینے کی جستجو کر رہے ہیں............''

لوز چیذغ کی پہلی سالگرہ کا بڑا جلسہ

نوکیں دور شمارہ 12

1990۔ صفحہ 5

16 اگست 1990 کو پاکستان آرٹس کونسل (ادارہ ثقافت بلوچستان) کوئٹہ کے خوبصورت ہال میں ''لوز چیذ غ'' کی پہلی سالگرہ کی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک ''سیمینار'' کا اہتمام کیا گیا جس کا موضوع ''بابائے استمان'' تھا۔ اس تقریب میں ''لوز چیذ غ'' کے ممبران کے علاوہ میر بزنجو کے عقیدت مندوں نے بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا۔ اس مذاکرہ میں ملک کے معروف دانشور، ادیب، شعرا، صحافی، سیاست دان اور میر صاحب کے رفقا نے ان کی زندگی اور سیاسی جدوجہد پر مقالات پیش کیے۔

اس مذاکرہ کی صدارت ملک کے بزرگ سیاست داں اور میر صاحب کے سیاسی ہم سفر جناب ملک فیض محمد یوسف زئی نے کی۔ پہلے خاص مہمان ''لوز چیذ غ'' کے سرپرست اور معروف ترقی پسند دانشور پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی تھے اور دوسرے خاص مہمان بلوچی زبان کے روشن خیال شاعر، نقاد اور ''لوز چیذ غ'' کے صدر جناب سلطان قیصرانی تھے اور نظامت کے فرائض ''لوز چیذ غ'' کے سینئر نائب صدر اور بلوچی کے افسانہ نگار صبا دشتیاری نے انجام دیے۔

مقالہ نگاروں میں پروفیسر بہادر خان رودینی، ڈاکٹر سید امیر الدین، پروفیسر نادر قمبرانی، مشہور مؤرخ ملک سعید دہوار، پروفیسر گل بنگلزئی، ڈاکٹر کہور خان اور جناب طاہر بزنجو کے اسمائے گرامی شامل ہیں جبکہ معروف شاعر عطا شاد نے میر صاحب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا اور بلوچی کے نوجوان شاعر جناب غلام نبی بزدار نے بلوچی کے معروف ترقی پسند شاعر اور دانشور جناب اللہ بشک بزدار کی میر صاحب کے متعلق لکھی ہوئی نظم پڑھ کے سنائی۔

صدر محفل اور مہمان خصوصی کے خطبہ سے پہلے ''لوز چیذ غ'' کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر شاہ محمد مری نے ''سیکرٹری رپورٹ'' پیش کی۔ سالگرہ کے اس باسعادت موقع پر بلوچی کتابوں کا ایک اسٹال بھی لگایا گیا۔

سیکرٹری جنرل کی رپورٹ

معزز ومحترم ملک فیض محمد یوسف زئی صاحب، ماما عبداللہ جان، قیصرانی صاحب اور محترم سامعین۔ آج ہماری تنظیم ''لوز چیذ غ'' کے قیام کا ایک سال پورا ہوگیا ہے۔ یعنی آج ہم اپنی تنظیم کی پہلی سالگرہ منا رہے ہیں۔ اپنی سالانہ کارکردگی کی رپورٹ پیش کرنا جمہوری تنظیموں کی ایک روایت بھی ہے اور رواج بھی۔ اور ہم بھی اسی رواج کی پیروی کرتے ہوئے اپنی تنظیم کی اس پہلی سالگرہ کے موقع پر اس کے ایک سال کی کارگزاری بتانے کی جسارت کر رہے ہیں۔ وگرنہ ''لوز چیذ غ'' کے رفقا جانتے ہیں کہ زبان وادب کی خدمت کے عظیم کام میں ہمارا حصہ اب تک بہت قلیل اور حقیر ہے۔ مزید برآں ایسے وسیع کام کے لیے ایک سال کا عرصہ بہت مختصر ہوتا ہے۔

دوستو ہم نے اپنی تنظیم کے قیام کے فوراً بعد اس کی ممبر سازی شروع کی تھی۔ اس وقت ہمارے کل ممبران کی تعداد دوسو سے زائد ہے۔

ہم نے اپنی تنظیم کے لیے ایک ہدف یہ متعین کیا تھا کہ وسائل کی دستیابی کے بعد اخبار، رسالے یا جریدہ کا اجرا کیا جائے گا۔ وسائل تو برابر نہ ہوئے البتہ'' نوکیں دور'' نامی رسالہ شائع ہونا شروع ہوا۔ اب تک اس کے تین شمارے چھپ چکے ہیں اور تازہ ترین شمارہ یہیں سٹال پر آج موجود ہے۔

گوکہ'' نوکیں دور'' کی پذیرائی ایک سنجیدہ، وضع دار اور معیاری رسالے کے بطور ہوئی ہے مگر آج بھی اس کی اشاعت کے لیے درکار روپیہ موجود نہیں۔ ہم نے کسی کے سامنے زبان وادب کی خدمت کے نام کا کچکول تو نہیں پھیلایا مگر بااثر، دولت مند اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز لوگوں کے کان تک یہ بات پہنچائی ضرور ہے کہ ہمیں اس رسالے کی اشاعت کے لیے پیسے کی سخت ضرورت ہے۔ سرکاری اشتہارات آج کل ایسے احباب کے ہاتھوں میں ہیں جن سے تعاون کی امید بہر حال کی جاسکتی تھی۔

اسی طرح سکولوں، کالجوں اور سرکاری اداروں میں'' نوکیں دور'' کے اجرا سے بھی ہماری مدد کی جاسکتی ہے۔ علم دوست حضرات اس کے خریدار بن کر بھی ہمارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ غیر معینہ مدت کے لیے قرض کی بجائے دس روپے نقد ادا کیا کریں۔

مگر بدقسمتی سے اب تک یہ سب کچھ نہ ہوسکا۔ ہمارے دوست اپنی جیب سے، اپنی آمدن سے رسالہ نکالتے ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے ادارے ادارے گھوم کر لوگوں سے فرداً فرداً مل کرا سے بیچتے ہیں۔ اس صورت حال میں ہم سارے تکلفات کو ایک طرف رکھ کر علم دوست اور محبّ وطن احباب سے گلہ بھی کرتے ہیں، انہیں اپنی حالت بھی بتاتے ہیں اور اس کام میں ان کی ہم کاری اور مدد بھی چاہتے ہیں ۔ اس لیے کہ ایک ایسے پاک مشن کے لیے قبائلی انا، گوشہ نشینی اور خود پسندی ہلاکت آفریں امراض ہیں۔ گوکہ ہمارے ملک کی جمہوریت ابھی تک اپنی جھلکیاں ہی دکھاسکی ہے مگر عالمی سطح پر تو ایک ایسی فضا قائم ہوچکی ہے جہاں انسان کو اپنی بات کہنے کی آزادی ہے ۔ جہاں راز داری اور سسپنس کی بجائے کھلا پن مروج ہوگیا ہے اور جہاں لوگوں کی ایک بڑی اکثریت کی شرکتِ عمل وجود میں آگئی ہے۔ ہم اسی جدید عالمی ماحول کے حوالے سے آپ سے اپنی حالت نہیں چھپا رہے اور اسی فضا سے متاثر ہوکر آپ سے تعاون کی خواہش کا اظہار کر رہے ہیں۔

دوستو!'' نوکیں دور'' کے ذریعے ہم اپنی تنظیم کے مقرر کردہ کچھ اور اہداف بھی پورے کر رہے ہیں۔ اس رسالے میں نئے نئے لکھاری سامنے آرہے ہیں۔ بہت سے بزرگ قلم کار اپنا علم اور تجربہ عوام تک پہنچانے کے لیے'' نوکیں دور'' کو وسیلہ بنانے پر قائل ہوتے جا رہے ہیں۔ لوگوں کو بلوچی ادب وثقافت سے آشنا کرنے میں'' نوکیں دور'' کا حصہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ عالمی عوامی ادب کی ٹکڑیاں اب ہمارے گھروں میں بھی زیرِ مطالعہ آرہی ہیں۔ اورل پوئٹری کو گم ہونے سے بچانے کی پہلی بار سنجیدہ کوششوں کے ثبوت بھی'' نوکیں دور'' کے صفحات پر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ہماری کوشش رہی ہے کہ تحقیق کا جذبہ لوگوں میں پیدا ہو۔ ان مذکورہ شعبہ جات میں ہماری ایک سالہ کارکردگی اطمینان بخش رہی ہے۔

''لوز چیذ غ'' نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم زبان وادب کی ترقی ، اہم علمی وثقافتی معاملات اور ہم عصر سیاسی ومعاشی رجحانات کے بارے میں سیمیناروں، تنقیدی نشستوں، مشاعروں، ورکشاپوں اور سٹڈی سرکلوں کا انتظام کرتے رہیں گے۔ ہم نے طے کرلیا تھا کہ سال میں کم از کم دو سیمینار منعقد کرائے جائیں گے۔ ہمیں اطمینان ہے کہ ہم اپنی پہلی سالگرہ مناتے وقت دو کی بجائے تین کامیاب سیمینار منعقد کر چکے ہیں۔ ان سیمیناروں کے مقالے اپنے موضوعات اور مندرجات کے اعتبار سے

نہایت وقیع تھے اوران میں حاضری بھی اطمینان بخش تھی۔

لیکن ''لوز چیذ غ'' ابھی تک بلوچی کی ایک مکمل اور نمائندہ ڈکشنری مرتب کرنے کے ارادہ کے سلسلے میں کوئی ٹھوس کام نہیں کرسکی ہے۔ یہ کام ظاہر ہے کہ نہ تو ایک فرد سے ہوسکتا ہے اور نہ ہی ایک سال میں مکمل ہوسکتا ہے۔ البتہ اس کام کی شروعات ضرور کی جاسکتی تھی۔ ڈکشنری کے سلسلے میں ہمارے بہت سے دوست انفرادی طور پر کوشش کر رہے ہیں مگر ضرورت ہے کہ ان کوششوں کو مربوط بنا کر اس کام کو باقاعدہ سائنسی طور پر منظّم کیا جائے تا کہ چند سالوں میں تنظیم کا یہ ہدف پورا ہوجائے۔

ہماری سستی کی وجہ سے ابھی تک ایک بھی ادبی تنقیدی نشست منعقد نہیں کی جاسکی۔ مگر اب ہم اس طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ چنانچہ ''لوز چیذ غ'' اگلی جمعرات کو شام چار بجے اسی ہال میں ادبی تنقیدی نشست منعقد کر کے اپنی ماہانہ نشستوں کا باقاعدہ اجرا کر رہا ہے۔ یہ تنقیدی نشستیں ہر ماہ پہلی جمعرات کو منعقد ہوا کریں گی۔

اسی طرح آئندہ کے پروگرام میں ہم نے پشتو زبان کے نامور دانشور سائیں کمال خان شیرانی کی فکر اور شخصیت کے بارے میں ایک مذاکرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں ہم اسی سال ایک مشاعرہ کروانے کا فیصلہ بھی کر چکے ہیں۔

خواتین وحضرات! ہم ایک اور فریضے کی جانب بھی کوئی کام نہ کر سکے۔ ہمارا عزم تھا کہ ہم بلوچی زبان وادب کی ایک مکمل تاریخ مرتب کرنے کا کام شروع کریں گے۔ مگر ایک سال گزرنے کے باوجود ہم اس سلسلے میں ایک کمیٹی تک قائم نہ کر سکے۔

زبان وادب اور ثقافت کی ترقی کے لیے ایک بڑے ریسرچ سنٹر کے قیام والے ہمارے خواب کی تکمیل یقیناً بہت دور ہے۔ مگر یہ خواب ہم نے دیکھا تھا اور ہم اسے یاد رکھنے کی کوشش برسوں تک کرتے رہیں گے۔ ہم اعلان کے باوجود شولوخوف کے ایک مشہور ناول کا بلوچی ترجمہ چھاپ نہ سکے۔ اسی ہال میں موجود ایک دوست نے ہمیں دو ہزار روپے اس کتاب کی اشاعت کے لیے دیے ہیں۔ امید ہے کہ ہم اس کتاب کو بہت جلد آپ تک پہنچائیں گے۔

''لوز چیذ غ'' کے مینی فیسٹو میں یہ بھی تھا کہ ہم ملک کے اندر اور بیرون ملک قائم دوسری ادبی تنظیموں سے رابطے کریں گے، اوران کے ساتھ اشتراک واتحاد کی راہیں تلاش کریں گے۔ ہم نے

اس سلسلے میں اچھی پیش رفت کی ہے۔ ہم نے دوسری تنظیموں سے مل کر چند اہم قومی معاملات پر مشترکہ مؤقف اپنایا اوراس کا اظہار بھی کیا۔ ہمیں سید ہاشمی اکیڈمی کراچی سے اشتراک عمل کرنے میں خاطرخواہ کامیابی ہوئی ہے۔ اسی طرح ''لیاری ادبی وزیملی مجلس'' کے ساتھ بھی باہمی مفاہمت طے پا چکی ہے۔ ''گروخ'' ادبی تنظیم کوہ سلیمان سے انضمام کی حد تک بات چیت مکمل ہو چکی ہے، جس کا باضابطہ طور پر اعلان جلد متوقع ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین تو ہماری فطری اتحادی تنظیم ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف فکری قربت رکھتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ فکری وعملی اتحاد روز بروز مضبوط ہوتا جائے گا۔ اسی طرح ''سنگت لبزانکی کمیٹی'' کے عہدیداروں سے قربت اور ہمکاری کی عملی راہیں نکالنے کی بات چیت مکمل ہو چکی ہے۔ ''چلتن ادبی تنظیم مستنگ'' کے دوستوں سے حال ہی میں لوز چیذ غ کے ساتھیوں نے تعاون واشتراک کی درخواست کی ہے، جس کا مثبت جواب ملا ہے۔ لیکن ہمیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ابھی مزید کام کرنا ہے۔ بلوچی زبان و ادب کی ترقی کی خاطر بہت ساری تنظیمیں اس ملک میں کام کر رہی ہیں۔ ان کی ایک بڑی اکثریت سے رابطہ کرنا، ان سے اشتراک عمل کے سمجھوتے کرنا اور پھر ان مراسم کو مضبوط تر کرتے رہنا ہماری تنظیم کا مسلسل عمل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کام محنت طلب بھی بہت ہے اوراس میں وقت بھی بہت لگے گا۔ لیکن ایک سال کے عرصے میں ہم اس جانب اپنی پیش رفت سے مطمئن ہیں۔

دوستو، تنظیمی امور کے بارے میں صرف اتنا عرض کرسکتا ہوں کہ اس سال کابینہ کے نو اجلاس منعقد ہو چکے ہیں۔ جس سے ہماری آپس کی مفاہمت بڑھی اور ٹیم ورک کا احساس اجاگر ہوا۔ بلوچستان سیاسی سماجی اور تہذیبی طور پر ایک انوکھا علاقہ ہے۔ قبائلی نظام سماجی زندگی میں صرف ایک چیز کی بہتات کرتا ہے؛ وہ ہے شک وشبہ۔ اپنے ساتھی پر شک بے اعتباری کی حد تک ہم سب قبائلیوں کے خمیر میں موجود ہے جو کہ تنظیم کاری کا اولین دشمن ہوتا ہے۔ ہم نے اس ایک سال میں اس بے عتباری کی دھار کو کند ضرور کیا ہے۔ پھر ہمارے سیاسی نظام میں اقتدار پر جھپٹا مار کر قبضہ کرنے کی روایت پڑ چکی ہے۔ طاقت والا مارشل لا لگاتا ہے۔ پیسے والا اقتدار کے حلقوں کو خرید لیتا ہے اور درمیانہ طبقہ پھر ''تنظیم میں گھسو اوراس پر قبضہ کرو'' کے کلیے پر عمل کرتا ہے۔ شکر ہے کہ اب تک ''لوز چیذ غ'' میں ایسا نہ ہوا۔ اور ہم آپس میں امن وآشتی کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اس دور میں

مملکتِ خداداد پاکستان کے اندر اگر ایک تنظیم ایک سال تک ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہونے کی خبر آپ کو سنائے تو آپ اہلِ قلم کو حیرت آمیز مسرت ہوگی۔

دوستو، ہماری جنرل باڈی کا صرف ایک اجلاس منعقد ہوسکا ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ اس وحدانیت کو جلد توڑ دیں اور اس سال ایک دو مزید اجلاس منعقد کریں۔

''لوز چیذ غ'' کی باقاعدہ شاخیں قائم کرنا بھی اب تک ممکن نہیں ہوسکا ہے۔ یہ عمل انشااللہ اس سال شروع ہوگا تاکہ جہاں جہاں ''لوز چیذ غ'' کے ممبر موجود ہوں وہ اپنی تنظیم قائم کرلیں اور آزادانہ طور پر جمہوری انداز میں کام کریں۔ اسی طرح صوبائی اور مرکزی کمیٹیوں کا قیام اب تک عمل میں نہیں آسکا ہے، جو ہمیں اس سال بہر حال کرنا ہے۔

معزز خواتین وحضرات! ہم نے تنظیم بناتے وقت جس حتمی منزل کا تعین کیا تھا وہ آج بھی ہمارے ذہنوں میں تازہ ہے۔ ہم اس منزل تک رسائی کے لیے کام کرتے رہا کریں گے مگر اس مقصد کا حصول آپ تمام پڑھے لکھے، دردمند اور شریف انسانوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔ ہماری وہ حتمی منزل ایک ایسے ادارے کی تشکیل ہوگی جسے صحیح معنوں میں ''اکیڈمی آف سائنسز'' کہا جاسکے اور وہاں تک آپ ہم اکٹھے جائیں گے''۔

سال 1990

لوز چیدغ کی تنقیدی نشتسیں

اگست:

بلوچی زبان کی معروف ادبی تنظیم'' لوزچیذغ'' کی ماہانہ تنقیدی نشست 23 اگست 1990 کو شام پانچ بجے پاکستان آرٹس کونسل (ادارہ ثقافت بلوچستان) کوئٹہ میں منعقد ہوئی۔ اس نشست کی صدارت بلوچستان یونیورسٹی میں بلوچی زبان کی لیکچرر محترمہ زینت ثنا بلوچ صاحبہ نے کی۔

اس تنقیدی نشست میں جناب سلطان نعیم قیصرانی نے اپنا مضمون ''ادیب و دہشت گردی'' پیش کیا۔ اس پر جناب کریم بلوچ، ڈاکٹر فضل خالق، جناب عبداللہ بلوچ، ڈاکٹر لعل جان اور صبا دشتیاری نے کھل کر تنقید کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر فضل خالق نے اپنی غزل پیش کی جس پر صبا دشتیاری اور سلطان نعیم

قیصرانی نے اپنی معروضات پیش کیں۔ آخر میں صدر محفل نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بلوچی زبان و ادب کی ترقی اور نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کے لیے اس قسم کی نشستوں کی اشد ضرورت ہے۔ اس نشست میں پرانے اور نئے ادبا و شعراء اور بلوچی زبان کے خیر خواہ احباب نے بڑی تعداد میں حصہ لیا۔

ستمبر:

تنظیم کی دوسری ماہانہ تنقیدی نشست 29 ستمبر کو شام پانچ بجے پاکستان آرٹس کونسل (ادارہ ثقافت بلوچستان) کوئٹہ میں ہی منعقد ہوئی۔ اس نشست کی صدارت بلوچی کے معروف شاعر اور مترجم جناب غوث بخش صابر نے کی۔ معروف امریکی ماہر لسانیات پروفیسر سلویا اور محترمہ بیگم سلویا بطور خاص اس تقریب میں شریک ہوئے۔ (یاد رہے کہ محترم پروفیسر بلوچی زبان میں تحقیق کے سلسلے میں آج کل بلوچستان میں مقیم ہیں)۔

اس نشست میں سب سے پہلے نوجوان ادیب جناب کریم بلوچ نے بعنوان ''ٹریجڈی'' پیش کیا جس پر جناب غوث بخش صابر، ڈاکٹر فضل خالق، جناب غلام نبی بزدار نے بھرپور تنقید کی۔ اس کے بعد جناب صبا دشتیاری نے اپنا افسانہ تنقید کے لیے پیش کیا۔ تنقید میں حصہ لیتے ہوئے ڈاکٹر علی دوست، جناب منیر عیسیٰ، جناب سلطان قیصرانی، ڈاکٹر شاہ محمد مری، ڈاکٹر فضل خالق، جناب کریم بلوچ، جناب غلام نبی بزدار اور جناب غوث بخش صابر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں ڈاکٹر علی دوست نے اپنی نئی غزل تنقید کے لیے پیش کی جس پر جناب غوث بخش صابر جناب سلطان قیصرانی ڈاکٹر شاہ محمد مری جناب صبا دشتیاری اور ڈاکٹر فضل خالق نے اپنی اپنی معروضات پیش کیں۔

آخر میں صدر محفل نے اس تنقیدی نشست کی افادیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ایک زمانہ تھا کہ اس شہر میں اسی طرح کی محفلیں جمتی تھیں لیکن عرصہ دراز سے خاموشی رہی۔ ''لوز چیذغ'' نے تنقیدی نشستوں کا سلسلہ جاری کرتے ہوئے اس ادبی سکوت کو توڑا ہے اور یہ ایک خوش آئند بات ہے۔

******

اگست 1989 سے بہت ہی سرگرم انداز میں کام کرنے والی تنظیم ''لوز چیذغ'' مارچ 1993 تک ہی چل سکی۔ اس پونے چار سال تک چلنے والی تنظیم نے مستقبل کے لیے راہ متعین کرنے

والے ستاروں کی زیادہ وضاحت کردی۔عوام الناس کی کامیاب راہنمائی کرتے کرتے یہ کارواں بالآخر بکھر گیا۔اس میں پنہاں نئی کونپلیں نکھر آئیں اور کمٹمنٹ کو بہر حال دوام رہا۔

سال1993

پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن

(بار چہارم)

لوز چیذ غ کا عوامی قافلہ اب پھر اپنے پہلے والے نام کے ساتھ متشکل ہوا۔شاہ محمد مری کی لکھی اس کی رپورٹ ہم یہاں نقل کرتے ہیں جو کہ نوکیں دور 1993، مارچ اپریل میں شائع ہوئی۔

پروفیسر خلیل صدیقی کی صدارت میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی جنرل باڈی کا اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر امیر الدین سید نے افتتاحی کلمات پر انجمن کی گزشتہ چھ سال سے غیر فعال ہونے کی مختلف وجوہات کا تذکرہ کیا۔انہوں نے مشرقی یورپ میں تبدیلیوں کی بدولت چھائی ہوئی مایوسی کے خلاف جدوجہد کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا ابھی کچھ عرصے سے پہلے روشن خیال دوست انجمن کو دوبارہ سرگرم کرنے کی ضرورت محسوس کررہے ہیں اور بالآخر ایگزیکٹو کونسل کے اجلاس میں 26 مارچ (1993) کو فیصلہ کیا گیا تھا کہ جنرل باڈی کا اجلاس بلا کر نئی کابینہ کے انتخابات کرائے جائیں اور انجمن کی سرگرمیوں کے لیے پروگرام بنایا جائے۔آج کی جنرل باڈی کا یہ اجلاس انہی دو امور کے لیے بلایا گیا ہے۔سید امیر الدین نے پروفیسر خلیل صدیقی سے درخواست کی کہ وہ پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کے پس منظر میں آج اس کے فرائض اور اہداف کے بارے میں دوستوں سے خطاب کریں۔

پروفیسر خلیل صدیقی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا، انسان نے اپنے تمدنی سفر میں ملکیت کا احساس کرلیا تو اس احساس نے ترقی کا مفہوم بدل کر رکھ دیا۔اسی ملکیت کے احساس میں زندگی کی سہولتیں چند مراعات یافتہ لوگوں نے ہتھیا لیں۔وہ لوگ سب کچھ سمیٹتے رہے اور اس طرح استحصال شروع ہوگیا۔استحصال نئے نئے روپ دھارتا رہا اور انیسویں صدی میں جب صنعتی ترقی آسمان پر پہنچ گئی تو دوسری طرف استحصال بھی بڑھ گیا۔معاشی استحصال نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی اور سماج میں ایک تناؤ اور تشنج پیدا ہوا۔مراعات سمٹ کر مخصوص لوگوں تک پہنچ گئیں۔ایشیا اور

افریقہ غربت جہالت اور توہمات کے بوجھ تلے روندے گئے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد نسلی برتری کے احساس اور شاونزم کو فروغ حاصل ہوا۔لوگ نسل اور خون کو امتیاز کا معاملہ سمجھنے لگے اور ایک عمومی تخریبی ماحول وجود میں آ گیا۔اس صورت حال سے دانشوروں کو بہت دکھ ہوا اور اس ماحول سے باہر نکلنے کی تدبیریں شروع ہوگئیں۔کچھ دانشوروں نے غور شروع کردیا۔ایک کانفرنس منعقد کی اور ایک اعلان نامہ تیار ہوا۔برصغیر کے دو آدمی اس کانفرنس میں شامل ہوئے۔ملک راج آنند اور سجاد ظہیر۔پھر برصغیر کے دانشوروں نے لندن میں ایک اعلان نامہ تیار کیا۔یہ اعلان نامہ دراصل ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا منشور تھا۔پھر لکھنو میں 1936 میں کانفرنس ہوئی جس کی صدارت پریم چند نے کی۔بڑے بڑے ادیبوں کے دستخط لیے گئے اور اس طرح یہ تنظیم یعنی پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن قائم ہوگئی۔اس سے قبل برصغیر کے سیاسی سماجی پس منظر نے اس تنظیم کے قیام کے لیے راہیں ہموار کی تھیں۔1933 میں اختر حسین رائے پوری نے ایک ہندی رسالے میں ''ادب اور انقلاب'' کے نام سے ہندی میں ایک مضمون لکھا تھا۔بعد میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا اور کچھ اضافے کے بعد ''ادب اور انقلاب'' نامی ایک کتاب شائع ہوئی۔اسی کتاب نے انجمن کے قیام کا پس منظر عطا کیا تھا۔اس سے پہلے سرسید، غالب، شبلی اور اقبال بھی راہ ہموار کر چکے تھے۔گو ان کے سیاسی نظریات متنازعہ ہیں مگر سماجی اعتبار سے ان کے رجحانات ترقی پسندانہ تھے۔گویا برصغیر میں ترقی پسندی پہلے پیدا ہو چکی تھی۔نئی نسل فرسودہ نظام سے بیزار ہو چکی تھی۔وہ نئی نسل بہت بے چین تھی۔ جب 1936 میں ایسوسی ایشن کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی تو نئی نسل کے نوجوان پیش پیش تھے۔انہوں نے بہت گرمجوشی سے اس انجمن کو خوش آمدید کہا۔اس طرح یہ آہستہ آہستہ ایک تحریک بنتی گئی۔تحریک دراصل ایک تجربہ ہوتی ہے، جب تجربہ منظم طور پر جاری رہے تو وہی تجربہ تحریک بنتا ہے۔

برصغیر میں بنگال اور جنوبی ہند نے سب سے پہلے اس انجمن کی آواز پہ لبیک کہا۔دوسری زبانیں بعد میں اس جانب متوجہ ہوئیں۔قافلہ جاری رہا اور دیکھتے دیکھتے جو ادب پیدا ہوا وہ رجائیت سے بھرپور تھا۔قنوطیت دور ہوتی گئی۔ترقی پسند تحریک ہماری زبانوں کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ ادب اب بہت خوبصورت ہوتا گیا۔تنقید کی صنف بہت بہتر ہوتی گئی، روشنی اور اجالے پھیلتے جارہے تھے۔1938 میں دوسری کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی جس کا افتتاح ٹیگور نے کیا تھا۔1945 میں

حیدرآباد دکن میں کانفرنس ہوئی۔ بعد میں علاقائی بنیاد پر غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور تحریک کو بہت نقصان پہنچا۔ مگر سجاد ظہیر بہت دلیری کے ساتھ ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوششیں کرتے رہے جو کہ بالآخر کارگر ثابت ہوئیں۔ 1947 میں تقسیم ہند کے وقت جو ادب پیدا ہوا اس میں ترقی پسند ادب نے زبردست کام کیا۔ رجعت والے ادیب تو نسلی ادب پیدا کررہے تھے جبکہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں نے اس وقت صحت منداور توانا ادب تخلیق کیا۔ پاکستان کے بعد والے ادب پر کیا ماتم کیا جائے۔

پروفیسر خلیل صدیقی نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ ترقی پسندی صرف زبان کے اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ ہمارا رویہ ہے۔ ہمارا عمل ہی ترقی پسندی کی جانب لے جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے آج صرف کاغذات کے صفحات کو ترقی پسندی سمجھا جارہا ہے۔ الفاظ اور کاغذ کے صفحات ترقی پسندی نہیں بلکہ عمل ترقی پسندی ہے۔

جناب خلیل صدیقی کی تقریر کے بعد انجمن کے انتخابات عمل میں آئے اور مندرجہ ذیل عہدیداران متفقہ طور پر منتخب ہوگئے۔

سرپرست اعلیٰ: پروفیسر خلیل صدیقی

سرپرست: پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی

صدر: ڈاکٹر خدائیداد

جنرل سیکرٹری: سید امیر الدین

پبلسٹی سیکرٹری: افضل مراد

خزانچی: ڈاکٹر شاہ محمد مری

اس کے علاوہ نو رکنی ایگزیکٹو کمیٹی بھی منتخب کی گئی، جس کے ممبر یہ ہیں: نذر پانیزئی، پروفیسر نادر قمبرانی، پروفیسر بہادر خان رودینی، شیام کمار، محمد سرور، شاہ بیگ شیدا، محترمہ مہر النسا، رحمت اللہ مینگل اور اکرم دوست۔

اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ عوامی اور انقلابی شاعر حبیب جالب پہ ایک سیمینار کا انعقاد کیا جائے۔ یہ سیمینار یکم مئی کو ہوگا۔ اجلاس نے ماہانہ تنقیدی نشستیں منعقد کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔

اس کے بعد نو منتخب صدر ڈاکٹر خدائیداد نے اجلاس سے خطاب کیا۔ انہوں نے کہا کہ سرزمینِ بلوچستان جہالت کے اندھیرے میں رہی۔ یہاں ترقی کی شکل بھی کسی نے نہیں دیکھی۔ زندگی جامد ہے۔ یہ جمود کیوں ہے۔ نیند کی یہ حالت کیوں ہے۔ ہم بارہ صدی پہلے والے سماج میں رہتے ہیں، قبائلیت میں۔ قبائلیت کی شکل یہ ہے کہ آمروں اور حملہ آوروں نے ہمارے عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے انہیں قبیلوں میں تقسیم کردیا۔ خرکار کے جمعدار کی طرح ہر قبیلہ میں چھوٹے چھوٹے جمعدار بنائے۔ جمعداروں کے مجموعہ میں سے ایک کو سردار بنایا جو کہ آمر کا' بیرونی حملہ آور کا زیرنگیں تھا۔ یہ تھی بارہ صدی کے پہلے کی بات۔ جب سے یہاں کی تاریخ ہمیں معلوم ہے عوام کو اس سردار کے ذریعے سے قابو کیا جاتا رہا ہے۔ یہی آمر کسی آباد اور مہذب ملک پر لوٹ مار کرنے کے لیے جب ارادہ کرلیتا تھا تو اسی سردار کو حکم دیتا تھا جو جمعدار سے کہتا؛ ''آدمی اکٹھے کرو''۔ وہ جمعدار اس کی فوج کے لیے آدمی اکٹھا کرکے لاتا تھا۔ جمعداروں کے لائے ہوئے فوجیوں کے ساتھ آمر گھوڑے پر چڑھتا، آباد علاقوں پر حملے کرتا اور دولت کماتا۔ ہماری حالت آج بھی وہی ہے۔ غلامی اور جہالت کے وہی اندھیرے ہیں۔ ہم آج بھی بارہ صدی پہلے والی حالت میں جی رہے ہیں۔ آج یہی قبائلیت اس سے ذرا منظّم ہے، طاقت ور ہے۔ اسے نیا رنگ روپ عطا ہوا۔ گو کہ نیا رنگ روپ اسے ملا ہے، عوامی انتخاب کا نام دیا ہے اسے، مگر جب انتخاب ہوتا ہے تو یہی سردار لوگ آپس میں مقابلہ کرتے ہیں۔ جیتنے والا بھی سردار ہوتا ہے اور ہارنے والا بھی سردار ہوتا ہے۔ البتہ جیتنے والے کو ممبری اور وزارت کی اضافی سہولتیں بھی مل جاتی ہیں۔ سرداریت وہی ہے۔ قبائلیت وہی ہے، بس شکل نئی ہے۔ یہ سرداریت اس وقت تک چلے گی جب تک کہ جہالت کے اندھیرے موجود رہیں گے۔ جب تک ترقی کے راستے بند رہیں گے۔ قبائلی نظام اپنی وحشتوں کے ساتھ موجود رہے گا۔ جب بھی شعور آتا ہے تو اپنے لیے اظہار کا ذریعہ ڈھونڈتا ہے۔ اور علم شعور کے اظہار کا ذریعہ ہے۔

چھ سال قبل ہم دوستوں نے ترقی پسندی کا ایک قافلہ ترتیب دیا تھا مگر وہ بھی اندھیروں میں بھٹکتا ہی رہا۔ ہم نے ایک کنوینگ کمیٹی بنائی تھی۔ کچھ مہینوں تک ادبی نشستیں ہوتی رہیں، زندگی کی ایک جھلک پیدا ہوگئی تھی۔ مگر ہماری صفوں میں رجعتی لوگ گھسا دیے گئے تھے۔ وہ ہمارے ذہنوں پر اثر انداز ہوتے رہے۔ بہت دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مزدور تحریک کی طرح ہماری ایسوسی ایشن کو بھی سرمایہ

دارذہن چلاتے رہے۔آج خوشی کی بات ہے کہ اتنے زیادہ لوگ اکٹھے ہوگئے۔''مجسمہ گرنے'' کے بعد بہت پروپیگنڈہ کیا گیا کہ ترقی پسندی ختم ہوگئی۔میڈیا نے کتنا شور مچایا۔اس کے نتیجے میں روشن فکر لوگ بھی متاثر ہونے لگے۔ناامیدی بڑھتی گئی۔مسرت کی بات ہے کہ 1986 کی بنی ہوئی تنظیم دوبارہ بحال ہوگئی ہے۔ہم باعمل ہونے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ہم ناامیدیوں کو دور کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔ہم تصویریں بنا کر پتھر تراش کر زبان سے موسیقی سے‛ رقص سے مایوسی ہٹائیں گے۔ہم قلم سے روشنی پھیلائیں گے امید کی شمع روشن کریں گے۔ ہم سب چونکہ اس کام کے لیے تیار ہیں لہٰذا ناامیدی کی کوئی بات نہیں جو چھ سال تک غیر فعال رہنے کے بعد اب خود کو سنبھالیں گے۔اسی درمیان نیستی اور اندھیروں کے باوجود جب ہمیں موقع ملا، ہم اپنے موقف پر بولتے رہے ہیں۔ ہمارا کام بنیاد پرستی اور قبائلیت کے خلاف بولنا ہے۔ہم نسلی منافرت کے سخت ترین دشمن ہیں۔ ہم ادب وفن کی ہر صنف میں قبائلیت کے اندھیروں کو موضوع بنا سکتے ہیں۔قبائلی نظام ذلیل ہے۔اس ذلالت سے نفرت کرنا ضروری ہے۔اچھی زندگی کے حصول کے لیے عوام کو اپنی ذلیل زندگانی سے سخت نفرت کرنی ہوگی۔ ہماری تحریک میں کوئی بھی شخص اس بات پر فخر نہیں کرے گا کہ ہم بہادر ہیں۔ ہمارے شملے اونچے ہیں یا ہمارے رواج اچھے ہیں۔ایسی باتیں غلامی کو تقویت بخشتی ہیں۔ہمیں ان غیر انسانی باتوں پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔ان سے نفرت کرنا ہوگا۔تب ہی انسان آگے بڑھے گا۔

نومنتخب صدر ڈاکٹر خدائیداد کے فکر انگیز خیالات کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کی جنرل باڈی کا اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

جالب کی یاد میں سیمینار

مئی:

پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی جانب سے جالب پہ یہ یادگار سیمینار منعقد ہوا اور بہت شان سے منعقد ہوا۔''ماہنامہ نوکیں دور'' کے مئی، جون 1993 کے شمارے سے اِس کی رپورٹ ہم یہاں نقل کرتے ہیں؛

معروف انقلابی رہنما، جمہوریت کے انتہائی متحرک سفیر، اور مزدوروں کسانوں کے مفادات کے علمبردار شاعر حبیب جالب بلوچستان کے لیے سورج کی ہر تیز اور تمازت بھری شعاع کے

خلاف ہمیشہ ایک ٹھنڈا سایہ تھا۔ وہ گنجان آباد پنجاب میں بلوچستان کی سرائے کا مالک تھا۔ وہ ہماری سرزمین کا ماما تھا۔ مرگیا تو بہت دکھ ہوا اہل بلوچستان کو۔ اس دکھ کا اظہار اخبارات میں کیا گیا، اجلاسوں،، میٹنگوں اور اسمبلی کے ایوانوں میں بھی۔

مگر اس کی موت پہ سب سے زیادہ دکھ اُن دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کو ہوا جو خود بھی اس کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن کی دیوار سے ایک مضبوط اینٹ جو نکلی، ایک ایسا شانہ ان کی صف سے جدا ہوا جس نے کبھی جھکنا نہ سیکھا تھا۔ان دانشوروں کی تنظیم ''پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن'' نے حبیب جالب کی یاد میں ایک سیمینار منعقد کرانے کا فیصلہ کیا مگر مقررہ تاریخ پہ یہ سیمینار منعقد نہ ہوسکا۔ اس لیے کہ ایسوسی ایشن کے سرپرست جناب عبداللہ جان جمالدینی کو فالج ہوگیا اور زیست و موت کی کشمکش میں مبتلا اپنے اس محبوب ساتھی کی عیادت اور تیمارداری کے بے یقین شب و روز جالب سیمینار کو ملتوی کرتے گئے۔ جب میر عبداللہ جان عظیم الشان پر سے موت کے سائے ذرا سے چھٹے تو دوستوں نے 28 مئی کی تاریخ طے کی۔ چنانچہ جمعہ کی شام کو ادارۂ ثقافت بلوچستان کے ہال میں یہ تقریب منعقد ہوئی۔ یہ وہی ہال ہے جہاں پچھلے برس جالب اپنی سچی پکار اور مترنم آواز سے دلوں پر حکمرانی کر چکا تھا۔آج دیوار پہ اس کی تصویر اور دائمی کلام میں سے، ایک شعر کے سائے میں اس کے حبیب، اس کے سچے ساتھی، اسے یاد کرنے جمع ہوگئے تھے۔ بین الاقوامیت کا احساس بہت پاک اور لطیف ہوتا ہے۔ ہندوستان کے کسی اجنبی گاؤں کا جالب بلوچستان کے دل میں بعد از مرگ بھی موجود تھا۔ سچ ہے کہ جو لوگ دوسروں کے لیے جیتے ہیں، ان کی موت کل جہان کی موت ہوتی ہے۔

جالب کی یاد میں منعقدہ اس سیمینار کی صدارت پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کے صوبائی صدر ڈاکٹر خدائیداد نے کی۔ ڈاکٹر خدائیداد زبردست آرٹسٹ ہے۔ بلوچستان مزدور پارٹی اور لٹ خانہ تحریک کا بانی ہے اور اس خطے میں فکر و روشنی کے فروغ میں ایک شاندار رول کا مالک ہے۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر خلیل صدیقی کو ہونا تھا مگر خرابیِ صحت کے باعث اس اجلاس میں موجودگی کی حسرت لیے گھر میں ہی رہا اور بلوچی و اردو کا ممتاز شاعر عطا شاد اس سیمینار کا مہمان خصوصی بنا۔ یہ وہی عطا شاد ہے جسے پچھلی حکومت نے ملازمت سے معطل کر دیا تھا اور اسی ہال کے اسی سٹیج پہ ایک اور شاعر نے اس کی بحالی کا مطالبہ کیا تھا، وہ شاعر حبیب جالب تھا۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض پروفیسر نادر قمبرانی ادا کر رہا تھا۔

گرمی کی شدت کم ہوچکی تھی اور شام کے چھ بج چکے تھے۔ پروفیسر قمبرانی کے تعارفی کلمات کے بعد اسماعیل کاکڑ ڈائس سنبھال چکا تھا۔ ایک نوجوان شاعر پشتو زبان میں پنجابی بولنے والے حبیب جالب نامی ایک شخص کی شان میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے قصیدہ خواں تھا۔ آواز مترنم تھی اور جذبات سچے تھے۔ اندازہ ہوسکتا ہے کہ کتنی تالیاں بجی ہوں گی۔ پھر ایک اور نوجوان آیا۔ طالب علم رہنما تھا اور سٹوڈنٹس تحریک کے ساتھ جالب کی وابستگی اور ہمدردی کے واقعات سنا رہا تھا۔ اسے ادراک تھا کہ حبیب جالب موجودہ نظامِ تعلیم کو بدلنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ ایک نئے، مبنی بر انصاف اور ترقی پسند نظام کے قیام کے لیے وہ فرسودہ نظام تعلیم کو بدلنے کے اقدام کو اولین ترجیح قرار دیتا تھا۔ اس نوجوان نے بے شمار حوالے دے کر ثابت کیا کہ حبیب جالب تعصّبات سے بالاتر، ایک مکمل انسان تھا۔ اس نوجوان کا نام عبدالواحد موسیٰ زئی تھا۔

روتے اور شرارتیں کرتے ہوئے دو خوبصورت بچوں کی ماں اُٹھی اور سٹیج پر آ کر اپنا مقالہ پڑھنے لگی۔ یہ نائلہ قادری تھی۔ بلوچستان یونیورسٹی کی استاد۔ معروف ادبی اور علمی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ نائلہ ایک بے ساختہ مقرر ہے۔ پورا ہال اس کے فقروں کی مکمل گرفت میں ہوتا ہے۔ نائلہ کے مقالے کا عنوان تھا؛ ''مدو جزرِ سیاست اور حبیب جالب''۔ یہ دراصل لمحہ بہ لمحہ بدلتے ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے دوش بدوش جالب کی شاعری کی کرونولوجی تھی۔ نائلہ اس وقت جالب کے اشعار کی دوستی میں خاص طور پر جکڑ گئی جب ستر کی دھائی میں بلوچستان میں آئینی بحران عروج پر تھا۔ لڑائی مسائل کا حل سمجھی گئی تھی اور جالب فوج کشی کے خلاف اذان دے رہا تھا۔ افغانستان میں قبائلی بنیاد پرستی پر مبنی بادشاہی نظام کا خاتمہ ہوا اور سوشلزم کے قیام والے طبقات نے اقتدار سنبھالا۔ نائلہ نے انقلابِ ثور کے ساتھ جالب کی یک جہتی کے ترانے سنائے۔

نسیم اچکزئی نے جالب کی ایک نظم کا پشتو میں خوبصورت ترجمہ سنا کر زبردست داد حاصل کی۔ نوشین قمبرانی نے جالب کی ایک نظم گا کر سنائی۔ جالب کی شاعری اور نوشین کی آواز بلا شبہ ایک دوسرے کے شایانِ شان ہیں۔

سید امیر الدین نے اپنے مقالے میں ڈکٹیٹر شپ، ملائیت اور سرمایہ داری کے خلاف جالب کے ٹکراؤ پر مفصل روشنی ڈالی۔ سید صاحب پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کا صوبائی سیکرٹری جنزل

ہے۔ وہ ماہر تعلیم اور شہر کی فعال سماجی شخصیت ہے۔ امیر الدین نے جالب کے بلند کیے ہوئے پرچم پہ امن مساوات اور اخوت کے کندہ الفاظ خود بھی پڑھے اور سامعین کو بھی پڑھائے۔ وہ اسے ظلمتوں کا اولین دشمن قرار دیتا ہے۔ جالب محنت کشوں کے عالم گیر فلسفے کا ساتھی تھا اور اسے بھلایا نہ جا سکے گا۔

پروفیسر نادر قمبرانی نے ''سچ اور سچائی'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ حبیب جالب نسل، رنگ اور فرقے کی بنیاد پر امتیازات کا قائل نہ تھا۔ وہ سچ کا گوتم اور حق کا منصور تھا۔ وہ ہماری دھرتی کا گیلیلو تھا۔ نادر صاحب نے جالب کو گل زمین کا پجاری، وطن کا سچا عاشق، مفلسوں ناداروں کا دوست، امن انسانیت اور شرافت پر مٹنے والے ایک انسان کے روپ میں دیکھا۔

طاہر محمد خان ایڈووکیٹ اپنا طویل مقالہ پڑھنے جب اٹھا تو سامعین نے پرجوش تالیوں سے اس کا استقبال کیا۔ طاہر صاحب ممتاز قانون دان ہے، انسانی حقوق کمیشن کا صوبائی سربراہ ہے۔ وہ خود سیاست بھی کرتا ہے، سیاست پہ تجزیہ اور تبصرہ نگاری بھی۔ بلوچستان کی سیاست پہ اس کی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ اپنے مقالے میں اس نے حبیب جالب کو ایک مجاہد قرار دیا۔ اس نے پاکستان کی تاریخ میں دو اُردو شعرا کو تکرار کے ساتھ جہد کہتے اور جہد کرتے دیکھا: ایک فیض احمد فیض اور دوسرا حبیب جالب۔ اس نے کہا کہ تاریخ میں بعض افراد مثال کے مصداق بن جاتے ہیں اور جالب استقلال، پامردی اور سچ کی مثال بن گیا۔ اس کے تئیں بڑا سیاست دان اور بڑا ادیب وہ ہے جو دلیری کے ساتھ سچ بول سکتا ہے۔ جالب کی زندگی سچ بولتے گزری۔ اس نے جالب کو بیسویں صدی کی آواز کہا۔

اس محفل میں میر عبداللہ جان جمالدینی کا پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا۔ اپنی شدید بیماری کے باوجود فکرِ جالب سے اپنی مضبوط وابستگی کے ہاتھوں مجبور جمالدینی صاحب نے اس پیغام کے ذریعے محبانِ جالب کی اس محفل میں ان کے درمیان موجود ہونے کا احساس دلایا۔ جالب کی حق گوئی اس کی نظر میں وصفِ پیغمبری تھی۔ اسے جالب کی عوام دوستی پہ رشک ہے اور اس حوالے سے اس نے اپنے عزم کا اظہار کیا کہ عوام سے اس کی محبت اور عشق خلل پذیر نہیں، اسے دنیا کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔ جمالدینی جیسے بڑے شخص نے فکرِ جالب سے تقویت پانے کا برملا اظہار کیا۔ اس کے پیغام کو بہت پیار، تقدس اور اپنائیت سے سنا گیا۔ ہال میں موجود لوگوں نے عبداللہ جمالدینی کی صحت اور تندرستی کے لیے دعا بھی کی۔

نور محمد ہمدم نے جالب کی شان میں اپنی نظم سنائی جس کے بعد اس شام کے مہمان خصوصی عطا شاد کو بلایا گیا۔ عطا شاد بولا۔ اور بہت اچھا بولا۔ تقریباً فی البدیہہ تقریر میں اس نے فیض، غالب اور اقبال کی شاعری کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا کہ جالب کی شاعری محض نعرے بازی نہیں۔ اس کی شاعری میں معنویت ہے، گہرائی ہے۔ حبیب جالب کے کلام کا کسی بھی بڑے شاعر کے اشعار سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ فارم کے حوالے سے جالب شاعری کے ہر معیار پر پورا اترتی ہے۔ جالب عوام کا شاعر تھا۔ وہ مشاعروں اور نشستوں میں کم پڑھتا تھا بلکہ اس کے برعکس وہ ہزاروں لاکھوں کے مجمع کو دیوانہ بناتا تھا۔ مگر پھر بھی اس کی شاعری نہ محض لفاظی ہے نہ جذباتی اور نہ ہی وقتی ہے۔ جالب کی شاعری انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ عام آدمی سے بغیر کسی واسطہ یا لغات کے مخاطب ہوتا ہے اور ہمیشہ اپنے مطلب کی بات کرتا ہے جو دراصل عوام کے مطلب کی بات ہوتی ہے۔ اور یہ دلچسپ ہے کہ جب جالب بولتا تھا لوگ سنتے تھے، سن کر سمجھ لیتے تھے اور اسی وقت ریسپانڈ کرتے تھے۔ جالب اپنی شاعری پہ داد اپنی زندگی ہی میں پا چکا تھا۔ بلاشبہ جالب جیسا اونچا شاعر اور عام فہم مخاطب بہت دیر تک اس دھرتی پہ نہ آئے گا۔ مخدوم محی الدین کے قافلے کا یہ ساتھی تاریخ میں اپنے لیے مقام بنا چکا ہے اور وہ مقام اونچا بھی ہے اور عالی مرتبت بھی۔ عطا شاد کی فصیح تقریر کا ہال میں موجود لوگوں نے بہت تپاک کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

اسٹیج سیکرٹری نے صدرِ جلسہ کو خطاب کیا دعوت دی۔ ڈاکٹر خدائے داد نے جالب کو اپنے نظریے کے ساتھ وفادار رہنے پر خراج پیش کیا۔ راہِ پُر خار پہ وقار کے ساتھ چلنا جالب کا منفرد اعزاز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بلوچستان میں قبائلیت کے دوام پر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ اس نے حاضرین کو آج کی اس ضرورت کا احساس دلایا کہ باشعور انسانوں کو تاریخ کے ارتقائی عمل کو تیز رفتاری سے جاری رکھنے کے لیے سامراجی سازشوں سے اُمیدوں کے گرائے گئے مجسمے پر آہیں بھرنے اور ہاتھ ملنے کے بجائے عظمت کے مجسمے کو نئے سرے سے تراشنا، تعمیر کرنا اور بلند کرنا ہے۔ صدرِ محفل ڈاکٹر خدائے داد نے اس اُمید کے ساتھ کارروائی کے اختتام کی اجازت دے دی کہ اب روشن خیال دانشور سامنے آئیں گے۔ عظمتِ انسان کے کاررواں کا یہ سفر جاری رہے گا۔

******

پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن میں ہم چلتے رہے۔ اس کی تنظیمی شکل کبھی ابھرتی کبھی ڈوبتی رہی اور ایک وقت جا کر ڈاکٹر خدائیداد اس کا صدر اور افضل مراد جنرل سیکرٹری بنا۔

مگر بات نے بننا نہ تھا، نہ بنی۔ تنظیمی انداز میں کوئی بڑی پیش رفت نہ ہوئی۔ کہیں کوئی شاخ قائم نہ ہو سکی۔ بس لے دے کر چند کتابیں اِس پلیٹ فارم سے چھپیں مگر وہ بھی اپنی انفرادی جیب سے چھپیں، نام تھا کمپنی کا!

پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کے بینر تلے چھپی ہوئی کتابیں یہ تھیں:

* **ابیتگیں راہ** (بلوچی شاعری کا مجموعہ) از ڈاکٹر علی دوست بلوچ
* زرءِ مروارد (بلوچی شاعری کا مجموعہ) از مراد ساحر
* کمیونسٹ مینی فیسٹو (بلوچی ترجمہ) از شاہ محمد مری
* موہن جودڑو کا جوگی (سوبھو گیانچندانی کی سوانح عمری) از ڈاکٹر شاہ محمد مری
* کاویل (براہوی شاعری) از افضل مراد
* یادداشتیں از ملک فیض محمد یوسف زئی۔

سال 1997

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

یوں تو **لوز چیذغ** ہی کے منشور میں ایک ''اکیڈمی آف سائنسز'' کے قیام کی خواہش درج کر دی گئی تھی اور اُس کی طرف کام بھی جاری رہا مگر **لوز چیذغ** کے بکھر جانے اور پھر PWA بننے اور گم ہونے کے بعد سے اس تصور کو ''سنگت اکیڈمی آف سائنسز'' کے نام سے عملی بنانے کا باقاعدہ کام شروع ہوا۔ اور پھر 1997 میں کوئٹہ سے ماہنامہ **سنگت** شائع ہونا شروع ہوا۔ اس رسالے کے ادارتی بورڈ اور تحریروں میں وہی ٹیم شامل رہی جو **نوکیں دور** کے زمانے میں تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ایک تحریک بنتی گئی اور بالآخر غیر اعلامیہ طور پر، اور غیر محسوس انداز میں سمجھئے کہ سنگت اکیڈمی آف سائنسز کا قیام عمل میں آیا۔

جمعہ پارٹی سے سنڈے پارٹی تک

اس بات کا تذکرہ بھی کردوں کہ بہت عرصے سے کوئٹہ کے احباب ہر جمعہ کو ڈاکٹر خدائیداد کے گھر محفل لگاتے تھے۔اس گھر کا نام اس نے ''پریم مندر'' رکھا تھا۔بحثیں چلتیں،تبصرے ہوتے ۔ فلسفہ،پرسیاست وادب پر......۔ جائز ناجائز، پارلیمانی غیر پارلیمانی ہرطرح کی بحثیں ۔ لگام بہت ڈھیلی ہوتی جب امیرالدین موجود ہوتا،اور لہجے بہت مہذب ہوتے جب عبداللہ جان جمالدینی یا کوئی نوواردوست موجود ہوتا۔ یاروں نے ان محفلوں کو بلوچستان جمعہ پارٹی (BJP) کا نام دیا۔بعدازاں جب پاکستان نے جمعہ کے بجائے اتوار کو چھٹی کا دن قرار دیا تو یہ محفلیں اتوار کو سجنے لگیں۔لہٰذا بی جے پی کا نام بھی بدل گیا اور آٹو میٹک انداز میں بی ایس پی یعنی''بلوچستان سنڈے پارٹی'' رکھ لیا گیا۔ بی ایس پی، **سنگت اکیڈمی** کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔بی ایس پی ڈاکٹر خدائیداد کے گھر سے اُس وقت منتقل ہوئی جب عبداللہ جان جمالدینی پہ (1993 میں) فالج کا دورہ پڑا۔تب سے بی ایس پی کا ہیڈ کوارٹر جمالدینی صاحب کے ہاں شفٹ ہوگیا۔ جو اکیس برس سے آج تک بلا ناغہ جاری ہے ۔ سچی بات ہے ذہنی تربیت کے لیے یہ اِن فارمل ہفت روزہ مجلس ودیوان بہت مددگار رہا۔اس میں کوئی ایجنڈا نہیں ہوتا، کوئی صدارت، سٹیج سیکرٹری گیری نہیں ہوتی ۔ بیمار پرسی کا عام رواجی فریضہ۔ جہاں ساڑھے گیارہ بجے سے احباب آنا شروع کرتے ہیں اور ڈیڑھ بجے تک بیٹھتے ہیں۔ عام گپ شپ رہتی ہے۔ اور جو موضوع عبداللہ جان جمالدینی کو اچھا لگے، ماما اس پر بولنے لگتا ہے۔درمیان میں لقمہ بازی ہوتی رہتی ہے۔اس طرح یہ محفل باوقار تو رہتی ہے مگر کلاس روم والی خشکی نہیں رہتی۔ ہر دوست کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی دلچسپ بات کرے۔کسی نئی کتاب کی، کسی نئے عوامی ابھار کی، کسی نئی سائنسی دریافت کی۔

ایک خصوصی بات یہ ہوتی ہے کہ پاکستان بھر کے مشترکہ دوستوں (اب ''بی ایس پی'' کے وابستگان کے سارے ملکی و بین الاقوامی دوست مشترک ہیں) کی خیریت کا بلیٹن ماما کو ضرور سنانا ہوتا ہے ۔وہ کرید کرید کر جو پوچھتا ہے ۔دوستوں کے بارے میں، اُن کے میاں/بیوی کے بارے میں، اُن کے خالہ زادوں چچازادوں کے بارے میں ۔انسائیکلو پیا ہے ماما۔ڈیڑھ بجے ایک دوست اعلان کرتا ہے کہ حاضرین کو اپنی جاری بات کو ختم کرنے ،سگریٹ کے آخری سوٹا لگانے کے لیے مزید پانچ منٹ دیے جاتے ہیں۔اس کے لیے براہوئی کے ایک گیت کا مصرعہ'' کامبوکراڑی آ،کراڑی گل وگلزارے''

کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے''چلو کَرانی چلتے ہیں، اس لیے کہ وہاں گل وگلزار ہے''۔لہٰذا کرانی (اپنے اپنے گھروں کو) جانے کے لیے پانچ منٹ کے بعد وہی دوست ''یاعلی'' کہہ کر اٹھ جاتا ہے۔باقی بھی سب اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔

اب بیس برس سے جاری اس محفل سے ملک بھر کے سیاسی ادبی لوگ آشنا ہو چکے ہیں۔لہٰذا صوبے کے اندرونی علاقوں سے لے کر ملک کے دوسرے صوبوں سے جس شخص نے کوئٹہ آنا ہوتا ہے وہ اتوار کا دن ضرور بچاتا ہے،سنڈے پارٹی کی محفل میں شامل ہونے کے لیے۔افغانستان کے عبدالرحمٰن پہوال ان محفلوں میں بیٹھے، کراچی سے مسلم شمیم، راحت سعید، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، سید شمس، رمضان' ڈاکٹر کرتارڈ انوانڑیں، محمد بن احمد، ڈاکٹر شمیم' عرفان خان، فہمیدہ ریاض، فاطمہ حسن، گلشن آرا سید، شوکت زیدی، سوبھوگیانچندانی، اور حسن عسکری آتے رہے۔ اسلام آباد سے افتخار عارف، عالیہ ہود بھائی، امریکہ سے جاوید بھٹو اور انیس ہود بھائی، لاہور سے وجاہت مسعود، ملک محمد علی بھارا، احمد سلیم، تنویر جہاں۔ ملتان سے ڈاکٹر کرامت علی، ڈاکٹر انوار احمد، پشاور سے سلیم راز، ڈاکٹر جہانزیب، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین..........الغرض یاروں کا ایک جھرمٹ ہے جو سنڈے پارٹی کی محفلوں کی رونق بڑھاتا رہا۔ سچی بات یہ ہے کہ بلوچستان سنڈے پارٹی نے سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے قیام، دوام اور پھر تسلسل میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔اُسے تنظیمی گھٹن سے بچایا،اس میں شگفتگی، شائستگی، روایت اور برداشت کے اوصاف پیدا کیے۔

پروگریسو ڈاکٹرز فورم اور بزنجو فاؤنڈیشن

یوں ہماری نیم ادبی و نیم سیاسی تحریک چلتی رہی۔ اور نئی نئی کونپلیں نکلتی رہیں۔ یہیں پر سنگت اکیڈمی کے دوستوں کی مدد وحمایت سے''پروگریسو ڈاکٹرز فورم''PDF بنی۔جس نے لوگوں کا مفت کیمپ لگا لگا کر علاج کیا۔خون جمع کرنے کے کیمپ لگائے۔

اسی سلسلے میں نوجوانوں (بالخصوص بولان میڈیکل کالج کے شاگردوں) نے''میر غوث بخش بزنجو فاؤنڈیشن'' کے نام سے ایک تنظیم بنالی۔اسی کالج کے طالب علموں نے''دی ہیلرز'' نام کی ایک رفاحی تنظیم قائم کی اور بے بس اور بے کس مریضوں کی مدد و راہنمائی کی۔اپنا خون دیا، اپنی جیب خرچ بانٹی۔سنگت اکیڈمی آف سائنسز ہر لحاظ سے ان تنظیموں کے ساتھ ساتھ تھی۔دوست

کسی نہ کسی صورت ان تنظیموں کے ساتھ رہے۔

سال2002

اگست:

دوروزہ بزنجو امن تقریبات

بزنجو فاؤنڈیشن اور سنگت اکیڈمی نے میر غوث بخش بزنجو کی برسی کے موقع پر دس اور گیارہ اگست 2002ءکو ادارہ ثقافت بلوچستان کے تعاون سے تقریبات کا انعقاد کیا۔ان تقریبات کا مقصد بزنجو صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے فکر کے حوالے سے باتیں کرنا تھا۔ان دونوں اداروں نے اس سے پہلے بھی بزنجو کی برسی کے حوالے سے تقریبات منعقد کیں لیکن اب کے بین اللسانی مشاعرہ،فکر بزنجو اور قبائلی امن سیمینار،اور واجہ عبداللہ جان جمالدینی کی کتاب لٹ خانہ کی تقریب رونمائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بین السانی مشاعرہ ایک خوبصورت آئیڈیا ہے جسے ان اداروں نے عملی جامہ پہنا کر ایک خوبصورت روایت کی بنیاد رکھی ہے۔۔اس بین اللسانی مشاعرے میں اردو، بلوچی، پشتو، براہوئی، ہزارگی، پنجابی، سرائیکی زبانوں کے شعرانے اپنا کلام پیش کیا۔اور داد وصول کی۔

اس روایت کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس سے جہالت،تعصب اور آپس کی دشمنیوں کی بیخ کنی میں مدد ملے گی۔ بلوچستان میں قبائلی کشت وخون کا بازار گرم ہے،اس برادر کشی کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس نے زندگی کی خوبصورتیوں کو دیمک کی طرح چاٹ ڈالا ہے۔ ہر طرف اندھیروں کا راج ہے۔موت کا رقص اپنے عروج پر ہے۔ مایوسی کی سیاہی گہری ہوتی جارہی ہے اور اس مایوسی کی سیاہی کو روشنیوں میں بدلنے کے لیے ہم سب کو ایک ساتھ مل کر محبتوں کے دیے جلانے ہوں گے۔

اس حوالے سے جب ہم ماضی کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں نوکیں دور اور پھر ادارہ سنگت کی کوششیں بھرپور انداز میں نظر آتی ہیں۔ ماہتاک سنگت نے ایک تسلسل کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کا ادراک کرتے ہوئے مضامین اور اداریے شائع کیے ہیں۔ظلم، ناانصافی اور جہالت

کے خلاف جدوجہد کا یہ بہترین طریقہ ہے اور اس جدوجہد کو جاری رہنا چاہئے جب تک کہ ہماری تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں روشنی کھل اٹھے، اور زندگی کی مسکراہٹ واپس آسکے۔

اس اگست کی شام کو بین اللسانی مشاعرے کی صدارت پشتو اور اردو میں یکساں مقام کے حامل پروفیسر رب نواز مائل نے کی۔تقریب کا مہمان خصوصی بلوچستان کا معتبر ادیب اور بلوچی زبان کا سینئر لکھنے والا غوث بخش صابر تھا جبکہ میزبانی کے فرائض محسن شکیل نے ادا کیے۔ پروفیسر رب نواز مائل نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ عبدالصمد خان اچکزئی اور غوث بخش بزنجو ان شخصیات میں سے ہیں کہ اگر تاریخ سے ان کا نام ہٹا دیا جائے تو کچھ نہیں بچے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے جمہوری شعور پیدا کیا اور بتایا کہ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرو۔اس نے کہا کہ اصل جنگ سرمایہ داری اور غربت کے درمیان ہے۔

اپنی پشتو نظم کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے کہا کہ میں نے اپنی پشتو نظم میں لکھا تھا کہ دو روٹیاں ہوں، دو کپڑے ہوں اور سر پر چھت ہو تو بس اور کچھ نہیں چاہیے، پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔

مائل صاحب کے علاوہ مندرجہ ذیل شعرانے اپنا کلام سنایا:

غوث بخش صابر،نسیم احمد نسیم، ماجد حسین ماجد،مقدس خان معصوم،سلطان نعیم قیصرانی،غوث بہار، پروفیسر بیرم غوری، یوسف گچکی ،ڈاکٹر فضل خالق،ڈاکٹر علی دوست بلوچ،وحید زہیر،افضل مراد،ڈاکٹر سلیم کرد،طاہرہ احساس جتک ،ناظم صادق،علی کمیل قزلباش،پروفیسر خدائے دادگل،افتخار کاشف ،سعید کرد،منیر احمد منیر،علی بابا تاج، ڈاکٹر باری اسیر،شیر خان، جمال ترہ کی،عبدالغفور ساسولی ہمی پرواز،محسن بالاچ،شگفتہ سرمست،عدن عدیم،عبدالواحد شیرانی ،قادر نائل ،اسماعیل کرد، جو ہر بنگلزئی،اور محمد علی عدم۔امن مشاعرے کے میزبان محسن شکیل نے نظم سنائی جس کا عنوان تھا’’ پرندہ اڑتا رہے مسلسل‘‘۔

مشاعرے کے دوران کولڈ ڈرنکس سے مہمانوں کی تواضع کی گئی اور آخر میں سب کا شکریہ ادا کیا گیا۔اس طرح یہ امن مشاعرہ رات گئے اختتام کو پہنچا۔

دوسرا سیشن اگلے دن گیارہ اگست کو صبح دس بجے منعقد ہوا۔ یہ سیمینار تھا،جس کا عنوان تھا؛

''فکر بزنجو اور قبائلی امن''۔ یہ موضوع بڑا ہی حسبِ حال تھا کہ قبائلی جھگڑوں کے نتیجے میں جاری کشت وخون نے تباہی مچادی تھی۔ یہ موضوع حسبِ حال رہے گا میرے وطن میں بہت دیر تک، اُس وقت تک جب موضوعی قوت ابھر کر معروضی صورت حال کو گلے سے نہ پکڑ لے اور اسے یکسر بدل نہ ڈالے (امید میں رہو بھیڑو، کہ بہار آئے گی ضرور)۔

اس سیشن کا صدر معروف دانشور جناب پروفیسر عزیز بگٹی تھا۔ اس نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ قبائلی جنگوں کے خلاف پہلی آواز مست توکلی نے اٹھائی۔ جس نے کہا تھا کہ: ''اچھی نہیں ہوتیں جنگ اور کشت وخون کی باتیں''۔ مست توکلی نے یہ اشعار اُس وقت کہے تھے جب وہ اپنے لوگوں کے ساتھ مخالف گروپ سے لڑنے جارہا تھا۔ یہ اشعار کہہ کر وہ واپس ہوا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ لوگ اس کا جینا دوبھر کردیں گے۔ اسے طعنے دیں گے، اسے لغور کہیں گے۔ لیکن وہ شاعر تھا۔ اُسے دنیا وی کروفر سے کیا لینا دینا۔ وہ تو ایک ایسا شاعر ودانشور تھا جو محبت اور امن کا داعی تھا۔ اسی طرح میر غوث بخش بزنجو کی عدم تشدد کی پالیسی نے مست توکلی کی آواز کو تقویت بخشی۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر عطا اللہ بزنجو نے فیوڈل ازم کی تاریخ اور قبائلی امن کے حوالے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میر بزنجو نے قبائل اور سیاسی گروہوں میں باہمی احترام پیدا کرنے کی کوشش کی کیونکہ وہ ایک وسیع النظر سیاست دان تھا، ایک دانشور تھا۔

وحید زہیر نے اپنے مخصوص انداز میں موضوع کے حوالے سے اظہار خیال کیا اور شرکائے تقریب کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ محسن بالاچ نے ماہتاک سنگت کا اداریہ، ڈاکٹر سعید مستوئی نے مرحوم ڈاکٹر امیر الدین کا لکھا ہوا مضمون جو اس نے میر غوث بخش بزنجو کے حوالے سے لکھا تھا، پڑھا۔ نصیر احمد بلوچ نے قبائلی کشت وخون اور فکر بزنجو کے حوالے سے مضمون پڑھا۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری نے واحد بزدار کا لکھا ہوا مضمون پیش کیا۔

واحد بزدار کے خیال میں ہمارا ادیب اور دانشور اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کررہا، وہ مصلحتوں کا شکار نظر آتا ہے۔ سچ کہنا اس نے چھوڑ دیا ہے۔ نام نہاد ادیبوں اور دانشوروں پر تنقید کرتے ہوئے اس نے حقیقی ادیب اور دانشوروں پر زور دیا کہ اب بھی وقت ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا ادراک کرتے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کریں۔ قبائلی کشت وخون کے خلاف جہاد کریں۔ جہاں علم

وآگہی کی روشنی ہوگی، وہاں انسانیت کی تذلیل نہیں ہوگی، بے حسی اور درندگی نہیں ہوگی۔ اس حوالے سے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ جہاں معاملات میں عقل وخرد کی بجائے بندوق سے کام لیا جاتا ہو۔ جہاں قبائلی نظام کا متبادل نظام بھی نہ ہو۔ وہاں اہلِ قلم، ادبا اور شعرا کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔

قبائلی تنازعات کے حوالے سے ایک خوش آئند بات یہ سامنے آتی ہے کہ لانگو قبائل کے درمیان تصفیہ ہوچکا ہے جسے ہم امید کی کرن سمجھتے ہوئے ایک قابلِ تحسین قدیم قرار دیتے ہیں۔ یہ تصفیہ جن قبائلی، سماجی سیاسی اور علمی شخصیتوں کی کوششوں سے ہوا ہے، انہیں ہم مبارک باد دیتے ہیں۔ ابھی بہت سے قبائل دست وگریباں ہیں، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ ان قبائل کے تنازعات کو بھی حل کرنے کی ضرورت ہے۔

دوروزہ بزنجو امن تقریبات کا آخری پروگرام عبداللہ جان جمالدینی کی کتاب ''لٹ خانہ'' کی تقریب رونمائی کا تھا۔ اس پروقار تقریب کا مہمان خصوصی پروفیسر نادر قمبرانی تھا، جبکہ صدارت میر عبدالرحمٰن کرد نے کی۔ میزبانی کے فرائض نوشین قمبرانی نے ادا کیے۔ میر عبدالرحمٰن کرد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ لٹ خانہ محض ایک کتاب نہیں ہے، نہ ہی یہ کوئی کہانی ہے بلکہ یہ زندگی گزارنے کا انداز ہے۔ اس نے لٹ خانہ کے حوالے سے حالات وواقعات کا ذکر کیا کہ کس طرح میر عبداللہ جمالدینی نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اکٹھا کیا، اپنے خیالات اور ترقی پسند افکار ان کے ذہنوں میں منتقل کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ استعفیٰ دے کر کوئٹہ آگیا اور ایک مخصوص جگہ ڈیرے ڈال دیے اور پھر یہیں کا ہوکر رہ گیا۔ اسی جگہ کا نام لٹ خانہ قرار پایا۔ اس نے عوام کی فلاح وبہبود کے لیے تحریک اٹھائی جس کا مقصد ترقی وخوشحالی تھا اور پھر تاحیات اس کے لیے کام کیا۔ ان لوگوں نے تاریخ وثقافت اور ادب کو زندہ رکھنے کے لیے کام کیا۔ کئی ماہنامے، ہفت روزے اور روزنامے شائع ہونا شروع ہوئے۔ اس طرح یہ تحریک آگے بڑھتی چلی گئی۔

اس کے بعد اس نے میر عبداللہ جان جمالدینی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ بہت اعلیٰ صفات اور اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ اس تحریک میں کام کرنے والوں نے خوب کام کیا اور ایسا کام کیا جو اب تک جاری ہے۔ اگر ہم صرف علمی حوالے سے دیکھیں تو اس وقت بمشکل بیس لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن ان کے لاکھوں شاگرد آج ملک کے کونے کونے میں موجود ہیں۔ یہی تو ان کی تحریک

تھی۔ان کے تیار کیے ہوئے شاگرد ہماری وہ نشانیاں ہیں جن کی قدر کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر نادر قمبرانی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج ’’لٹ خانہ‘‘ کی صورت میں بابا جمالدینی کے مشاہدات اور تجربات ہمارے سامنے ہیں۔لٹ خانہ سے اپنی وابستگی کے حوالے سے اس نے کہا کہ ہم لٹ خانہ میں اُس کے توسط سے جاتے تھے اور جب بھی گئے ہمیشہ یہی سمجھتے کہ ہم ترقی پسندی کو جان گئے ہیں۔اس کے تجربات نے ہمیں منزل تک پہنچایا۔لٹ خانہ علمی وشعوری مرکز تھا۔ ’’لٹ خانہ‘‘ پڑھنے سے آپ کو اس زمانے کے عقائد، خیالات اور جدوجہد کا اندازہ ہوگا۔ان لوگوں نے تحصیلداری چھوڑ کر مفلسی میں زندگی گزاری۔اپنے اس بزرگ اور استاد سے ہم نے ہمیشہ کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کی۔نئی نسل کی سوچ میں اور تحریروں میں جو ترقی کی لہر نظر آتی ہے، وہ اسی کی مرہونِ منت ہے۔اللہ اسے سلامت رکھے۔

ماما جمالدینی نے بہت مختصر الفاظ میں اظہار خیال کیا۔اس نے کہا کہ ہر شخص اپنے آپ کو اور اپنے ضمیر کو بہت بہتر انداز میں جانتا ہے۔اسے پتہ ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا سوچتا ہے۔علم کے لیے ہمارا ایک فریضہ ہے، اسے پھیلانا۔اگر ہم علم نہیں پھیلاتے تو بخل سے کام لیتے ہیں۔لٹ خانہ کا نتیجہ شاہ محمد مری اور رسالہ سنگت ہیں۔ڈاکٹر خداداد عظیم ہے جو اب تک لٹ خانہ میں رہ رہا ہے۔اس نے کہا کہ ہم امن پر یقین رکھتے ہیں۔اس نے چند برس قبل ہونے والی کانفرنس ’’قلم برائے امن‘‘ کو سراہتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں اس طرح کے اجتماعات وتقریبات ہونی چاہئیں۔اس نے کہا کہ ہم سب نے مرنا ہے اور مرنے کے بعد ہڈیوں کے ڈھانچے ہی رہ جائیں گے۔تمام الفاظ اور خیالات صرف زندگی کے ساتھ ہیں۔اگر ہم ایسا سماج اور ایسا نظام نہیں بنا سکتے جہاں لوگ مطمئن زندگی گزار سکیں تو پھر کسی بھی چیز، اور کسی بھی بات کا کوئی فائدہ نہیں۔

ڈاکٹر خدائے داد نے لٹ خانہ کے حوالے سے بتایا کہ یہ ایک تحریک تھی اور عبداللہ جان جمالدینی نے اس کے بارے میں لکھ کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔یہ معمولی کتاب نہیں بلکہ یہ ایک بہت بڑا کام ہے۔

پروفیسر بیرم غوری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ لٹ خانہ ظلم کے ہاتھ پر بیعت سے انحراف کی تاریخ ہے۔ماما جمالدینی نے ایک بار کہا تھا کہ شہر کی رونق شاعروں سے ہوتی ہے۔میں

آج اس موقع پر کہنا چاہوں گا کہ شہروں کی رونق لٹ خانہ کی عظیم شخصیات سے ہوتی ہے۔

ڈاکٹر باری اسیر نے ’’دشمن سے‘‘ کے عنوان سے نظم سنائی۔نائلہ قادری نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

وحید زہیر نے لٹ خانہ کی سیاست اور ماما کی خدمات کے حوالے سے تاثراتی مضمون پیش کیا جس کا عنوان تھا ’’مردہ شہر کی زندہ تاریخ‘‘۔اس نے کہا کہ لٹ خانہ تحریک تنظیمی صورت میں باقی نہیں رہا لیکن اس کا مونوگرام عبداللہ جان جمالدینی کی سچائی میں زندہ ہے۔جو لوگ سب کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، وہ کامیاب رہتے ہیں۔اس نے کہا کہ پھل دار درخت کے لیے کانٹ چھانٹ ضروری ہے۔بےثمر یونہی بڑھتا رہتا ہے۔اور پھر جلانے کے کام آتا ہے۔اس نے کہا کہ اگر ہم غور کریں تو ہم اپنے آپ میں تنہا زندگی گزار رہے ہیں۔زندگی کی ان سنسان گلیوں میں لٹ خانہ آباد کرنے کی ضرورت ہے۔

ظفر معراج نے کہا کہ میں بدھا سے بہت متاثر ہوں، اسے پڑھتا اور سوچتا ہوں۔تصویروں میں اسے دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہوں۔جب بھی میں اس کے بارے میں پڑھنے اور اسے دیکھنے کے بعد سوچتا تو وہ مجھے کہیں بیٹھے فکر میں ڈوبا ملتا۔لیکن جب میں عبداللہ جان جمالدینی سے ملا تو مجھے بدھا بچوں، بڑوں میں ہنستا کھیلتا اور باتیں کرتا ہوا ملا۔لٹ خانہ کے حوالے سے اس نے کہا کہ بابا بزنجو نے جس سیاست کی ابتدا کی تھی، اس کتاب کے آخری صفحے پر انتہا تک پہنچ گئی۔اس نے کہا کہ لٹ خانہ سیاست اور سیاسی کاروبار کا فرق ہے۔محبت اور نفرت کا فرق ہے۔یہ محض کتاب نہیں بلکہ خواہش ہے۔جیسے کسی بھی خواہش کو کہانی بنا کر بزرگ بچوں کو سناتا ہے اور اس جدوجہد کا بتاتا ہے جس کا حاصل اس کا گھر، خاندان اور حیثیت ہے۔اس نے کہا کہ لٹ خانہ محض تاریخ نہیں، حال بھی ہے اور بابائے بلوچستان اس کتاب کے ذریعے ہر شخص میں لٹ خانے کی چابیاں بانٹتا آیا ہے۔

انور احسن صدیقی کا مقالہ پروفیسر سلطان نعیم قیصرانی نے پڑھا۔اس نے کہا کہ لٹ خانہ ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے جن کا تعلق سیاسی نشیب وفراز سے ہے اور اجتماعی انقلابی جدوجہد سے۔عبداللہ جان جمالدینی کے حوالے اس نے کہا کہ ادبی حوالے سے اس کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔اس نے براہوئی، پشتو، اردو اور بلوچی چاروں زبانوں میں بہت کیا۔اس کی شخصیت کے

اہم ترین پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نے کہا کہ سوچ سمجھ کر مؤقف اپنانا اور اس پر سختی سے عمل کرنا اس کی شخصیت کا اہم حصہ ہے۔

محسن شکیل نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔نوشین قمبرانی نے ترنم سے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

کئی نیک خواہشات اور دعاؤں کے ساتھ یہ پروقار تقریب اختتام کو پہنچی۔

سال 2003

اگست:

دوروزہ بزنجو تقریبات

سنگت اکیڈمی آف سائنسز ہر سال دوروزہ ادبی فکری تقریبات منعقد کرتی رہتی ہے۔اور چونکہ بلوچستان میں عقل واستدلال،فکروتفکر، گفت وشنید، ووٹ و پارلیمنٹ اور بات چیت کا آدمی میر غوث بخش بزنجو ہی رہا،اس لیے یہ تقریبات اسی کے نام سے منسوب چلی آتی ہیں۔بات چیت چونکہ کبھی غیرسیاسی نہیں ہوتی،اس لیے ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ یہ تقریبات غیرسیاسی نوعیت کی ہوتی ہیں۔لیکن ایک بات اٹل ہے کہ ان تقریبات میں سیاسی پارٹیوں کی بات نہیں ہوتی۔گوکہ کچھ مقررین کبھی کبھی پٹڑی سے پھسل کر ان تقریبات کو اپنی سیاسی پارٹی کے مؤقف کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر چونکہ گزشتہ تین چار سال سے ان تقریبات کا ایک مخصوص رجحان بن چکا ہے،لہٰذا ایک آدھ فقرے کے بعد مقرر خودبخود پھر اکیڈمک لائن اپناتے ہیں۔ان تقریبات کو حتماً سائنسی اور اکیڈمک رکھنے کے لیے آرٹس کونسل کے عبداللہ بلوچ کا بڑا حصہ رہا ہے کہ وہ مارشل لا جیسے سخت دنوں میں بھی یقین اور اعتماد کے ساتھ عطا شاد آڈیٹوریم ان تقریبات کے لیے مہیا کرتا رہا ہے۔وہ بھی خالی خولی نعرے بازی کی بجائے ٹھوس مسائل پہ بات کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔فکری مباحث اور سائنسی حل تلاشنے کا عمل بلوچستان میں ہمیشہ سست رہا ہے۔چنانچہ وہ بڑی خندہ پیشانی سے سنگت تقریبات سے امیدیں وابستہ رکھتے ہوئے ساتھ دیتا ہے اور تقریبات کے اختتام پر مطمئن ہوجاتا ہے۔ان تقریبات میں بزنجو فاؤنڈیشن کا ڈاکٹر عطااللہ بزنجو ایک فعال، سرگرم اور ہمہ وقتی کارکن ثابت ہوا۔شب وروز کی محنت سے

وہ ان تقریبات کی کامیابی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔وہ ان تقریبات کا سیکرٹری، کارکن، ہرکارہ، مالک، ترجمان، خزانچی سب کچھ ہوتا ہے۔میر غوث بخش بزنجو کا ایک اور شیدائی یونس خالد ہے جو جناب زمرد حسین مرحوم کا بھتیجا ہے۔وہ اپنی تنظیم عورت فاؤنڈیشن کے ساتھیوں کے ساتھ ان تقریبات میں معاونت کرنے اور ان کی کامیابی کے لیے بہت خلوص سے کام کرتا ہے۔(انسان دوست نظریات انسان کو انسان بناتے ہیں،اور انسان بنائے رکھتے ہیں)۔

بلوچستان میں سنجیدہ بحث مباحثوں کے اجرا اور ترویج کے بہت سے حامی لوگ موجود ہیں۔وہ سب کے سب کسی نہ کسی طرح ان تقریبات کی انتظامی کمیٹی کے اراکین ہوتے ہیں۔اس طرح میر غوث بخش بزنجو اور اس کی فکر کے ساتھ محبت کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔یہ احباب بھی ان تقریبات کو اپنا سمجھ کر ان کے انعقاد سے لے کر کامیابی تک ہر قدم پہ ساتھ دیتے ہیں۔

اس برس ان تقریبات کو جان بوجھ کر بزنجو کی برسی کی تاریخ سے کچھ روز بعد رکھا گیا، تاکہ ایک تو اس روز دیگر تنظیموں کی طرف سے منعقدہ پروگراموں میں شرکت ممکن رہے، اور دوسرا یہ کہ برسی کی تاریخ سے ہٹا کر کے ان تقریبات کے آزادانہ انعقاد اور ممکنہ کلچرل پروگرام کی گنجائش نکل سکے۔

دوروزہ تقریبات اس طرح ترتیب دی گئیں کہ 16 اگست بروز ہفتہ سیمینار کے لیے مختص ہوا اور اتوار 17 اگست کتابوں کی رونمائی اور کثیر السانی مشاعرہ کے لیے۔افضل مراد، وحید زہیر، عارف ضیا، محسن شکیل، بیرم غوری، ماما عبداللہ جان جمالدینی، ڈاکٹر خدائیداد، محمد سرور، انوارالحق کاکڑ، عطااللہ بزنجو، نادر قمبرانی، نسیم اچکزئی، نذر حسین اور نورخان ان طویل بحث مباحثوں میں شامل تھے۔سیمینار کا عنوان ''عصری شعور میں بزنجو کا کردار'' رکھنے کا فیصلہ ہوا۔اور رونمائی کے لیے کتابوں کی سلیکشن ہوئی جن میں سے تین کتابیں سنگت اکیڈمی آف سائنسز نے اسی موقع پر شائع کی تھیں، دو کتابیں قلات پبلشرز کی تھیں اور ایک کتاب براہوی ادبی سوسائٹی کی شائع کردہ تھی۔ہر کتاب پر ایک ایک مبصر کے اظہار خیال کرنے کا فیصلہ ہوا۔کثیر السانی مشاعرے کے لیے تمام احباب نے افضل مراد کی سربراہی میں کام کرنا قبول کیا۔

تقریبات سے دس روز قبل انفرادی دعوت نامے بھی جاری کردیے گئے، تعلیمی ثقافتی اداروں کے نوٹس بورڈوں پہ بھی یہ دعوت نامے لگادیے گئے اور اخبارات میں بھی وسیع طور پر ان

تقریبات کی تشہیر کرائی گئی۔تقریبات کے لیے بینر بھی بہت پہلے بنوائے گئے اور ویڈیو کا انتظام یقینی بنایا گیا۔آخری ہفتہ میٹنگوں پہ میٹنگوں کا ہفتہ تھا۔ بھاگ دوڑ کا، تشویش و اطمینان کا ہفتہ۔سیمینار کے مقررین کو دس دن قبل موضوع دیا گیا تا کہ وہ اطمینان سے اپنے مغز دار مقالے تحریر کرسکیں۔ بھروسے کے دوست تھے، ہم خیال احباب تھے۔اس لیے صرف دو باتوں کی درخواست کافی نکلی: ایک یہ کہ سیاسی پارٹیوں، شخصیتوں اور تنظیموں کی باہمی چپقلش اور اختلاف کا ذکر نہ کیا جائے۔اور دوسرا یہ کہ اپنا مؤقف آٹھ سے بارہ منٹ تک واضح کرنے جتنا مواد لکھا جائے۔ایسا ہی ہوا۔

جیسا کہ ایسی تقریبات میں ہوتا ہے، ہمیں بہت سے دوستوں نے بڑھ چڑھ کر مدد دینے کی یقین دہانیاں کرادیں مگر روزِ مقررہ پہ نظر بھی نہ آئے۔اسی طرح بہت سے گمنام اور خاموش دوستوں نے توقعات سے برعکس ان تقریبات میں خوب خوب دلچسپی لی اور زبردست کام کیا۔محترم وہاب دلسوز کا فرزند ایسا ہی اچھا اور خاموش دوست ثابت ہوا۔کئی مقالہ خواں دوست اچانک دردِ شقیقہ میں مبتلا ہوئے اور ہمیں کوئی اور وارث شاہ تلاشنا پڑا۔ہم بہت حیران اور مسرور ہوئے جب ان تقریبات میں 90 فیصد سے زیادہ تعداد نوجوانوں کی دیکھی (جنہیں ایک ناترس ترین صحافی نما مولوی نے ''بچے'' لکھ دیا۔اللہ اس دوست کو ذہنی بلوغت عطا کرے)۔ ہال کی دو قطاریں خواتین سے بھری تھیں جو ایک زبردست، مثبت اور حوصلہ افزا بات تھی۔ ہمارے زبردست شاعر اور دور دیس کے ساتھی اللہ بشک بزدار کی اچانک موجودگی نے مسرتیں دوچند کردیں۔ بابو عبدالرحمٰن، ملک سعید دھوار، عبدالعلی کاکڑ، لال بخش رند اور یوسف مستی خان دعوت کے باوجود نہ پہنچ سکے۔میر صاحب کے ان دیرینہ رفیقوں کی نیک خواہشات ہی کامیابی کی ضمانت قرار پائیں۔

ہر مقالہ نگار، مبصر اور شاعر کو یادگاری تحفے کے بطور رونمائی والی ساری کتابوں کا ایک ایک سیٹ دینے کے فیصلے کو قلات پبلشرز کے نذر حسین نے بہت خوبصورتی سے عملی جامہ پہنایا۔خوبصورت پیکٹوں پر، نیز ہر کتاب پر بھی بزنجو تقریبات 2003 کے سٹکر لگا کر ایک بہت ہی خوشگوار روایت ڈال دی گئی۔ ہر سیشن میں ٹھنڈی مشروبات کی فراہمی کا بوجھ یونس خالد نے برداشت کیا۔

میر غوث بخش بزنجو کے نواسوں، پوتوں اور فکری رفیقوں کو منتظمین کی طرف سے خوبصورت بیج لگا کر ہال میں رنگارنگی پیدا کی گئی۔شکور بادینی ایڈووکیٹ نے میر صاحب پر بنائی گئی آڈیو کیسٹ بھجوائی۔

سیمینار آدھ گھنٹہ تاخیر سے شروع ہوا۔خوبصورت کمپیئرنگ نوشین قمبرانی نے کی، باری اسیر اس کا ساتھ دیتا رہا اور سعدیہ قاضی ان کی معاونت کرتی رہی۔اس نشست کی صدارت پروفیسر نادر قمبرانی نے کی اور بلوچی کے نامور ترقی پسند شاعر اللہ بخش بزدار کو مہمانِ خصوصی بنادیا گیا۔سندھی شاعری کے نوجوان اور تازہ دم سپاہی ننگر چنا نے میر عبداللہ جان جمالدینی کے پیغام پڑھنے سے ان بھاری تقریبات اور سنجیدہ سیمینار کا آغاز کیا۔شکیل بلوچ اپنے اچھے مقالے میں دو تین قابلِ اعتراض جھگڑالو جملوں کے ساتھ دوسرا مقرر تھا۔عطا اللہ بزنجو پختہ سوچ، روشن فکر، واضح لائن اور بُری اردو کے ساتھ بولا۔انوار الحق کاکڑ نے آج کے شعور سے بھرپور کمٹ منٹ کے ساتھ سٹیج پر حاضری دی۔اور پھر ڈاکٹر کہور خان آیا۔کہور مختصر قد کاٹھ کا آدمی ہے مگر وہ مختصر بول اور لکھ نہیں سکتا۔لفظ ''گنجلک'' اس کا تکیہ کلام بھی ہے اور طرزِ تخاطب بھی۔ وہ دراصل ''سٹیٹ آف دی آرٹ لیکچر'' کا آدمی ہے۔اس کے لیے الگ سیشن بمع سوال و جواب کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سیمینار کا آدمی نہیں ہے یا پھر اسے سیمینار کے لیے مقالہ لکھوانے کے طرز پہ ڈنڈے کے زور سے مجبور کیا جانا چاہیے۔حالانکہ اس نے اپنے طویل مقالے کے آخری تین صفحے پڑھے مگر وہی تین صفحے اس قدر جامع اور پُر مغز تھے کہ سمینار کے تقاضے پورے کر بیٹھے۔کہور کو تو بلوچی اکیڈمی کا چیئرمین ہونا چاہیے تھا۔

وحید زہیر سٹیج پر آتا ہے تو سامعین بہت ریلیکس ہو جاتے ہیں۔اس لیے کہ وہ ''گنجلک'' بات نہیں کرتا۔وہ الفاظ پر مشتمل گلیڈ ییٹرز کے Arena کا منیجر ہے۔وہ لفظوں کی رضا دیکھے بغیر ان کی باجماعت شادیاں کروادیتا ہے، خواہ نفسِ مضمون کا حمل ہی ضائع کیوں نہ ہو۔ایک شاعری ہے جو وہ نثر میں کہے جاتا ہے۔کسی کو چھیڑے بغیر، کسی کو ڈانٹے بغیر، کسی پہ چوٹ کیے بغیر..........وحید امید کا، نیکی کا، خیر کا مقرر ہے۔سامع کو ذہن پہ بہت زور دیے بغیر اپنے ساتھ کر دیتا ہے اور جدا ہوتے وقت اُس سے بے ساختہ تالیاں بجوا دیتا ہے۔سیمیناروں میں وحید کو دو مشکل مقررین کے درمیان میں ہی بولنے کی دعوت ملتی رہنی چاہیے۔وہ ایک زبردست ارتقا پذیر دانشور ہے۔

غوث بخش صابر تین درجن کتابیں اپنے نام سے لکھ اور ترجمہ چکا ہے۔ بہت سی کتابیں اس کی اولاد ہوتے ہوئے بھی اسے ''انکل'' کہنے پر مجبور ہیں۔(روٹی کیا کافر چیز ہے!)۔صابر کسی بھی ادارے سے خوش نہیں ہے مگر پھر بھی ہر ادارے کا مقرر بنایا جاتا ہے۔چنانچہ وہ شیر کے جتھے میں بھی ہوتا

ہے اور بکری کے ریوڑ میں بھی۔ اس کے لیے بزنجو بھی ٹھیک ہے، سردار بھی ٹھیک ہیں۔ سیمینار میں فکرِ بزنجو کے حق میں بولا، اسے ہمہ اوست قرار دے گیا مگر اگلے ہی دن اسے سرداروں کا ساتھی ثابت کرنے کے لیے مضمون لکھ مارا۔ حیرت ہوتی ہے جب مسیحی ایم پی اے ملاؤں کے ایم ایم اے کی تعریفیں کرتا ہے، اور حیرت ہوتی ہے جب کچلا، پچھڑا ہوا اور محنت کش پس منظر والا صابر سرداروں کی حمایت میں لکھتا ہے۔ غوث بخش صابر کی اردو اس کی بلوچی ہی کی طرح بہت اصلی، بہت صاف اور ستھری ہے۔

بیرم غوری میر غوث بخش بزنجو کا معتقد ہے۔ ہر سال اپنی ساری مصروفیات یہاں وہاں بھیج کر بزنجو کے فکر و فلسفہ کو توصیف پیش کرتا ہے۔ اس برس بھی اس کا مقالہ بہت ہی پُر مغز تھا۔ اس کا مقالہ سلطان قیصرانی نے پڑھا۔ وہ خوبصورت مستقبلیات کا نزول چاہتا ہے بلوچستان میں۔ یہ خوبصورت مستقبل طلوع ہو کر رہے گا، بلوچستان میں۔

پروفیسر عزیز بگٹی بلوچستان میں ترقی کے بارے میں بے فیصلہ ہی رہا۔ ترقی کے حق میں اور ترقی کی مخالفت میں بلوچ دانشوروں کی تقسیم کا ذکر تو اس نے تفصیل سے کیا مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ لائن کے کس پار کھڑا ہے۔ اس نے فیصلہ بزنجو کی روح پہ ڈال دیا۔ خود دور جا کھڑا ہوا۔ ہم اتنے بڑے دانشور کو فیصلے کی سخت گھڑی میں مبتلا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ریفری گیری تو ازل سے صرف اور صرف زمان (ٹائم) کو ودیعت ہو چکی ہے۔ اب کون مسیحا، کون بدھا آئے گا؟ آج کی نسل کو اپنی صلیب خود ہی اٹھانا ہے۔

شاہ محمد مری کے مقالے کے بعد اللہ بخش بزدار نے بہت گرمجوشی سے بابا بزنجو کی جمہوریت نوازی، دلیل دوستی اور پارلیمانی سیاست کا تذکرہ کیا۔ صدارتی تقریر پروفیسر نادر قمبرانی نے کی جس کے بعد ہم اس پہلے سیشن کی زبردست کامیابی پر مبارکبادیں دیتے اور وصول کرتے رہے۔ ایک بار پھر میٹنگ، ایک بار پھر اگلے پروگراموں پہ بحث و تمحیص۔

اخبارات نے اس پروگرام کو زبردست کوریج دی۔ سرکار کا ریڈیو البتہ گنگ تھا، سرکار کا پی ٹی وی اندھا تھا۔ جیو والے بے خبر تھے۔ خدا انہیں زندگی اور زندگی کی رنگینیوں سے آشنا کر دے، (مگر کرے گا نہیں کہ وہ اِن دلوں پہ جہالت کی مہریں قرنوں قبل لگا چکا ہے)۔

17 اگست کو ساڑھے پانچ بجے کے سیشن کے لیے چار بجے ہی ہال کھلوایا۔ یہ سیشن کتابوں

کی رونمائی کا تھا۔ ہال کے باہر **قلات پبلشرز** نے کتابوں کا سٹال لگایا تھا۔ اس سیشن میں بھی توقعات سے بھی بڑھ کر بہت بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ اس سیشن کی کمپیئر یونیورسٹی آف بلوچستان کے بلوچی ڈیپارٹمنٹ کی چیئر پرسن محترمہ زینت ثنا تھی، جس نے اس پروگرام سے قبل ہر کتاب کو تفصیل سے پڑھا تھا اور بہت ہی شائستگی سے عالمانہ وقار کے ساتھ پروگرام کو چلایا۔ اس قدر سنجیدہ پروگرام کو چلانے کے لیے بلوچی ڈیپارٹمنٹ کی چیئر پرسن ہی موزوں ترین شخصیت تھی، اسے خدا مزید عزت بخشے۔ اس سیشن کا مہمان خصوصی **قلات پبلشرز** کا نذر حسین زمرد تھا۔ صدارت ترقی پسند شاعر و ادیب اور اکیڈمی ادبیات بلوچستان کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر افضل مراد نے کی۔ اس سیشن میں کل چھ کتابوں کی رونمائی ہوئی۔ سب سے پہلے وحید زہیر کے براہوئی افسانوں کے مجموعے ''بروئے'' کے تعارف کے لیے نور خان محمد حسنی آیا جو خود اچھا ادیب ہے اور دو سفرنامے لکھ چکا ہے۔ اس نے نہایت تفصیل سے وحید زہیر کے طرزِ تحریر اور کتاب پہ روشنی ڈالی۔

لینن کی لکھی ہوئی کتاب To The Rural Poor کا ترجمہ میر عبداللہ جان جمالدینی نے ''دیہات کے غریب'' کے نام سے کیا تھا۔ کتاب، اس کے مصنف، ترجمہ نگار، ترجمہ کے معیار اور کتاب کے گیٹ اپ اور قیمت پر پروفیسر عرفان احمد بیگ نے بہت ہی خوبصورت تبصرہ کیا۔ وہ زارِ روس پہ بولا، انقلابی سوویت یونین پہ بولا، روس کے ردِ انقلاب اور بعد ازاں عالمی صورت حال پہ بولا، خود بلوچستان اور اس کی طبقاتی ساخت کے بارے میں بولا اور کتاب کی آج کے دور میں اہمیت پہ بات کی۔ اس کا تبصرہ واقعتاً کتاب کے شایانِ شان تھا۔

''مستیں توار'' پر تبصرہ عارف ضیا کی ذمہ داری تھی۔ یہ کتاب آزات جمالدینی کی بلوچی شاعری کی ہے جس میں انجم قزلباش کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب بھی سنگت اکیڈمی آف سائنسز نے شائع کی۔ عارف ضیا نے اپنے منفرد سٹائل میں اس کتاب پر عالمانہ گفتگو کی۔ ایسا بے تکبر عالم بہت بھلا لگتا ہے۔

''سوب'' کے نام سے افغانستان کے ٹریڈ یونین لیڈر جناب عبدالستار پردلی نے بلوچی ناول لکھا تھا۔ بلوچی کے اولین ناولوں میں ''سوب'' کا نام آتا ہے۔ افغانستان، پاکستان اور ایران میں طبقاتی جدوجہد پر یہ بلوچی میں لکھا گیا اب تک کا واحد ناولٹ ہے۔ شاہ محمد مری نے اس کا ترجمہ اردو

میں کیا ہے اور قلات پریس کوئٹہ نے اسے شائع کیا ہے۔محسن شکیل اس کتاب کا مبصر تھا۔محسن ایک زیرک اور فہمیدہ دانشور ہے۔اس نے ترجمہ کے معیار کی غربت پہ بولنے سے خوبصورتی سے احتراز کیا اور بہت دور سے موڑ کاٹ کر اچھی اچھی باتیں تلاش کر کے لاتا رہا۔ اس کے ہاتھ سے خدا کرے ہزاروں کتابوں کے تبصرے لکھے جائیں۔

چھٹی اور آخری کتاب بھی ''سنگت اکیڈمی آف سائنسز'' کی چھپی ہوئی تھی۔ یہ ملک محمد پناہ کی لکھی ہوئی اپنے دوست، ہم خیال اور رفیق کار جناب اسلم اچکزئی کی سوانح عمری تھی۔نرم خو اور نرم گو معلم اور عالم جناب نسیم اچکزئی نے اس کتاب کی افادیت، مندرجات اور جامعیت پر مفصل بات کی۔

کتابوں کی رونمائی والے سیشن کے خصوصی مہمان نذر حسین نے اپنے والد محترم زمرد حسین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کتابوں اور اشاعت سے اپنی وابستگی کا یقین دلایا۔سیشن کے صدر جناب افضل مراد نے کتابوں کی رونمائی کی روایت کو سراہا اور ان تقریبات کی کامیابی پر اطمینان کا اظہار کیا۔ محترمہ زینت ثنا نے اس پروقار سیشن کے اختتام کا اعلان کیا۔

نئے سیشن سے پہلے آدھی چھٹی ملی۔جس کے بعد شاعروں نے تقریبات پر اپنا خوبصورت قبضہ جمانا تھا۔

یہ آخری سیشن ڈاکٹر علی دوست بلوچ کے حوالے کر کے ہم کونے میں بیٹھ کر اپنے یار امیر الدین کو یاد کر رہے تھے کہ یہ ہمارا دوسرا فنکشن تھا جس میں اس نے ایک تنکے جتنا کام بھی نہ کیا، سارا بوجھ ہم دوستوں کے کندھوں پہ ڈال گیا تھا۔اس کی تو خیر معافی ہوسکتی تھی مگر جب ہم مل کر شاعروں پہ تبصرے، واہ واہ اور ہوٹنگ کرتے تھے تو زبردست مزہ آتا تھا۔اب ہم اکیلے زور سے داد دیتے ہوئے بھی آدھے میں رک جاتے ہیں۔جب (اتنا جلدی) مرنا ہی تھا تو دوسروں میں بری عادتیں کیوں ڈال دی تھیں؟۔

ڈاکٹر علی دوست نے ''قدح'' کی تکرار سے اپنی بلوچی غزل سنائی۔ پتہ نہیں وہ خود کتنی ''قدح نوشی'' کرتا ہوگا، مگر شاعری اچھی تھی۔بلوچی شاعری کا بڑا نام جناب یوسف گچکی اس سیشن کا صدر تھا جبکہ سلطان قیصرانی مہمان خصوصی۔ یہ نہ صرف کثیر السانی مشاعرہ تھا بلکہ یہ واقعتاً بلوچستان کا ایک نمائندہ مشاعرہ تھا۔ دالبندین، بسیمہ، ڈیرہ مراد جمالی، سبی، مکران، ڈیرہ غازی خان ہر جگہ سے

اپنے خرچے پر شاعر دوست آئے اور اس مشاعرہ کو رونق بخشی ....آبادی میں بھی نوجوانوں کا پلہ بھاری تھا، اور شاعری بھی ان کی اتنی اچھی تھی کہ اللہ بخش بزدار کو ہر محفل میں اس معیار کی تعریف کرنا پڑی اور نسیم اچکزئی تو باقاعدہ اپنی شاعری سنانے سے پہلے جوان شعرا کے زبردست معیار پر تقریباً پانچ منٹ کی تقریر کر بیٹھا۔سید طاہر، ناطق سولنگی (بختیار آباد سے آیا تھا)، عمران اسدی اور ایوب ناطق نے ابتدا ہی اچھی کر دی، بسیمہ سے آئے ہوئے عبید بلوچ نے بلوچی میں اپنا منجھا ہوا کلام سنایا۔عدن عدیم نے نہ صرف اچھی شاعری کی بلکہ دوسروں کے پڑھنے کے دوران واہ اور آہ کے نعرے بھی کافی زور سے بلند کیے۔ننگر چنا نے سندھی کے بجائے اردو نظم سنائی جس پہ زبردست تالیاں بجیں۔کامران کامی کے بعد خیر و برکت کی دعاؤں کے ساتھ غفور جان ساسولی نے براہوی شاعری کی۔محمد اختر اور شیدا زیدی کی خوبصورت شاعری کے بعد لوگوں نے جوہر بنگلزئی کے براہوی کلام پر داد دی۔ارشاد مستوئی آیا، ارشاد امر نے اپنا کلام سنایا، حمید عزیز آبادی براہوئی شاعری کے ساتھ آیا۔ ہمارے مولوی نما محنت کش شاعر افتخار کاشف نے اچھی غزل عطا شاد کی طرح پر سنائی۔علی بابا تاج نے فارسی میں ماہیے کا ترجمہ کیا۔ صلاح الدین صلاح، یار کی خاطر تباہ ہو کر خود کو تعمیر کہنے آیا۔محسن چنگیزی ظاہر ہے کہ اچھی شاعری ہی سنانے آتا ہے۔نور خان محمد حسنی نے براہوی کلام سنایا جبکہ نسیم اچکزئی نے پشتو میں خوبصورت غزل سنائی۔اس کے دو بیٹے تو مشاعرے میں توجہ کا مرکز رہے کہ بڑی جاں دار داد دیتے رہے۔ پروفیسر عظمی جون تو خیر اس سرزمین کا منجھا ہوا شاعر ہے، وہ اس بار عظیم انجم ہانبھی کے بغیر ہی آیا اور مشاعرے کو گرما گیا۔ اسحاق ساجد بزدار کوہِ سلیمان کی رنگت لیے بلوچی کلام سنانے آیا۔ وحید زہیر نے براہوی کلام سے نوازا۔محسن شکیل نے ایک اچھی غزل سنائی اور G-8 کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم سنا کر حاضرین سے تالیاں وصول کیں۔ پھر شاعروں کے اشتہاری، غمِ دوراں میں غلطاں اور گمنامی میں نامی گرامی اللہ بشک بزدار آیا، پورا ہال مسرت سے جگمگا گیا۔ایک بلوچی نظم، دوسری بلوچی نظم۔ پھر پیاسا مجمع چھوڑ پھرتی سے نیچے اپنی نشست پر آیا۔افضل مراد کی شاعری کا لطف لیا گیا۔ پروفیسر نادر قمبرانی پیرانہ سالی کو ایسی تیسی کہتے ہوئے تینوں پروگراموں میں آخر تک بیٹھا رہا اور نوشین قمبرانی کی مدد اور راہنمائی سے اپنی ڈائری کھنگال کھنگال کر براہوی اور اردو میں اپنی نگارشات نچھاور کرتا رہا۔

ایک ایک بوتل، (اور وہ بھی سافٹ ڈرنک کی) کے علاوہ بن کھائے، بن پیے، شعر و شاعری

کے دلدادہ لوگ حرف وشعر کے موتی چنتے رہے۔ بارہ بجے رات کو کہیں جا کر مہمانِ خصوصی کی باری آئی۔ سلطان قیصرانی نے رات کے اس پچھلے پہر ''شام کوآ'' نامی نظم کا انتخاب کیا۔ ساتھ میں بلوچی کی خوبصورت نظم سنائی اور پھر یوسف گچکی آیا۔ گچکی صاحب چونکہ گل خان نصیر کا حافظ ہے، اس لیے پہلے گل خان سنایا اور پھر اپنا بلوچی کلام عطا کیا۔ بہت میوزیکل شاعری ہے اس کی، اور بہت ماہرانہ انداز ہے اس کا۔

منتظمین تقریبات کے کامیاب انعقاد پر اگلے دن گیارہ بجے سے پہلے نہ جاگ سکے۔

رپورٹ:شاہ محمد مری

ماھنامہ سنگت کوئٹہ،اگست2003،صفحہ 60

نومبر:

لیکچر: بلوچ نیشنلزم کی بنیاد اور ارتقا

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے زیر اہتمام 16 نومبر 2003 کو دن گیارہ بجے آرٹس کونسل کوئٹہ میں ''بلوچ نیشنلزم کی بنیاد اور ارتقا'' کے موضوع پر ایک لیکچر کا انتظام کیا گیا۔ یہ لیکچر ڈاکٹر تاج محمد برسیگ نے دیا جس کی پی ایچ ڈی کا یہ عنوان تھا۔ اس لیکچر میں دانشوروں، لکھاریوں، یونیورسٹی اساتذہ، طالب علموں اور سیاسی کارکنوں کی بڑی تعداد نے حصہ لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پچھلے سال لندن سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ اس نے بلوچ، بلوچی زبان اور بلوچستان کی سیاست، معیشت اور تاریخ پہ بہت سے تحقیقی مقالے لکھے۔ ڈاکٹر صاحب کابل یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا۔ آج کل وہ اپسالا یونیورسٹی سویڈن میں استاد ہے۔ سنگت اکیڈمی کے چیئرپرسن نے ان تعارفی کلمات کے بعد ڈاکٹر تاج محمد برسیگ سے لیکچر کی درخواست کی۔

اپنے لیکچر میں ڈاکٹر تاج نے نیشنلزم کے لیے ضروری عناصر کا ذکر کیا جن میں ایک قوم ہونے کا احساس، ایک مشترک نام، ایک مشترک سرزمین، ایک مشترک تاریخ، مشترک ثقافت اور مشترکہ معاشی منڈی شامل ہیں۔ اس نے بلوچ قوم کے بارے میں بتایا کہ جدید زمانوں میں بلوچ قبائل کا زور اس وقت ابھرنے لگا جب ان کے علاقوں میں عرب سلطنت زوال پذیر ہونا شروع ہوئی۔ بلوچوں کی ثقافتی شناخت رند ولاشار کے عہد میں بھرپور انداز میں ہوئی۔ بلوچستان کو بحیثیت ایک فیوڈل

ریاست کے نصیر خان نوری کے دور میں اس زمانے کے سپر پاور فیوڈل ریاستوں نے تسلیم کیا۔ یہ فیوڈل ریاستیں ترکی، پارس اور مغل اور بعد میں افغان فیوڈل ریاستیں تھیں۔ ان کے بقول برطانوی عہد میں بلوچ بین الاقوامی خواہشات کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھے اور یوں بلوچوں کی قومی تحریک کا ارتقا رک گیا۔ ڈاکٹر تاج کے خیال میں کولڈ وار کے پورے عہد میں امریکہ، بلوچستان کو سوویت اثرات پھیلنے سے روکنے کے لیے استعمال کرتا رہا اور کولڈ وار کے خاتمے کے ساتھ ہی پورے خطے میں سٹیٹس کو، ختم ہوگئی اور طبقاتی وقومی تحریکیں نئے جوش اور ولولے سے شروع ہوئیں۔ بلوچ قومی تحریک بھی ان میں سے ایک ہے۔

لیکچر کے بعد فعال سوال جواب کا سیشن ہوا۔ یار جان بادینی کے ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر تاج کا کہنا تھا کہ آج بلوچ نیشنلزم کی بنیادیں 50 برس قبل کی بہ نسبت بہت مضبوط ہیں۔ اس لیے کہ دیہاتوں سے شہروں میں بلوچ آبادکاری بہت بڑھ چکی ہے، بلوچ قبائلی نظام میں زبردست شکست وریخت جاری ہے، ایک جاندار درمیانہ طبقہ وجود میں آ چکا ہے اور اس میں دانشوروں کی اچھی خاصی کھیپ پیدا ہو چکی ہے۔

جناب غفار ندیم کے سوال پہ اپنے ردعمل میں ڈاکٹر تاج نے کہا کہ چاکر اعظم، گوہرام لاشاری یا بجار کے وجود کے بارے میں سوال اٹھانے والے غیر بلوچ تاریخی، تحقیقی یا اکیڈمک حوالوں سے یہ سوال نہیں اٹھاتے بلکہ وہ یہ معاملہ سیاسی مقاصد سے اٹھاتے ہیں۔

ان شخصیات کو کسی خاص علاقے یا عہد میں لوگوں نے اختراع نہیں کیا بلکہ سیکڑوں برسوں سے روس، افغانستان، ایران بلوچستان اور سندھ، پنجاب اور ہند کے بلوچوں میں ان شخصیات کے وجود، عہد اور ان سے متعلق روایتیں کہانیاں یکساں انداز میں موجود رہی ہیں۔

جناب حکیم بلوچ کے استفسار پہ ڈاکٹر تاج محمد برسیگ نے بتایا کہ بلوچ لفظ فردوسی نے استعمال کیا تھا۔ اور اس انداز میں استعمال کیا تھا کہ وہ اس زمانے میں ایک منظم بڑی آبادی کے بطور ہزاروں سالوں سے آباد ایک نسل ہیں۔ بلوچستان کا لفظ تزکِ بابری، آئین اکبری اور نادر شاہ کے زمانوں میں مستعمل رہا ہے۔ اس لفظ کی حتمی شکل برٹش بلوچستان کی صورت میں آئی۔

جناب رزاق نادر نے سوال کیا کہ سٹیٹ تو سرمایہ داری عہد کا مظہر ہوتی ہے، آپ نصیر خان

نوری کے بلوچستان کو ریاست کس طرح کہیں گے؟۔ جواب میں ڈاکٹر صاحب نے ریاست، اس کے معانی، اس کی شناخت اور تنظیم کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور نصیر خان کی ہم عصر ریاست کے حوالے اور مثالیں دیں جسے احمد شاہ ابدالی چلاتا تھا۔ یہیں پر جناب رازق بگٹی نے اپنا مشاہدہ پیش کیا کہ افغانوں نے ہمیشہ تجاوز کیا، آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کیا حالانکہ وہ کوئی جدید ریاست نہ تھے۔ اس نے محمود غزنوی اور احمد شاہ کے حوالے دیتے ہوئے کہا کہ بلوچ اس کے برعکس رند لاشار کی صورت تیس برس تک باہم لڑتے رہے، اس کے بعد بھی ان کی آپسی جنگیں آج دن تک جاری ہیں۔ اس طرح بلوچ نیشنلزم کا ارتقا کیسے ممکن ہے؟ جناب غوث بخش صابر کے ایک سوال پہ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ ہر تحریک میں یہ خصوصیت موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کو ''سیاسیاتا'' ہے۔ ہمیں یہ حقیقت جان لینی ہوگی کہ قوموں کا تقابل ہمیشہ ان کی معاشی سماجی ترقی کے مراحل کی بنیاد پر ہوتی ہے اور ان مراحل میں سے کسی پر موجود ہونے سے ایک قوم اپنی قومی تشکیل کے پراسیس سے محروم نہیں ہوتی۔

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے چیئر پرسن نے ڈاکٹر تاج محمد بریسگ کے خوبصورت لیکچر پہ اسے مبارکباد پیش کی۔ ''سنگت لیکچر'' میں حاضرین کی آمد کا شکریہ ادا کیا اور انتظام کاری پہ آرٹس کونسل کے جناب عبداللہ بلوچ کے تعاون کو سراہا۔ اس طرح یہ خوبصورت محفل اختتام پذیر ہوئی۔

دسمبر:

بیادِ ڈاکٹر خدائیداد، ایک پروقار تقریب

بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں اتنی ہی سچائی ہے جتنی صبح، دوپہر اور شام میں، جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دن کے مختلف پہر قدرت کا تحفہ اور عمر کے یہ حصے زندگی کے رنگ ہیں۔ سب بات تو یہیں آکر ٹھہرتی ہے کہ سورج طلوع ہوتا ہے تو اسے غروب بھی ہونا ہے۔ انسان پیدا ہوا ہے تو اسے مرنا بھی ہے، کوئی ہمیشہ نہیں رہتا۔ بس اہم بات یہ ہے کہ ہم نے اپنا وقت کن کاموں میں اور کہاں خرچ کیا، اس کا حاصل کیا رہا؟۔ نفسانفسی کے اس دور میں جہاں ہر ایک کو اپنی پڑی ہے ایسے بھی لوگ موجود ہیں جنہوں نے ہمیشہ دوسروں کا سوچا اور اپنے آپ کو یکسر نظر انداز کیا، اپنے پاس کچھ نہ رکھا، اپنے فائدے کا کبھی خیال نہیں کیا اور اپنے دل و دماغ میں جو کچھ تھا دوسروں پہ لٹاتے چلے گئے۔ انہی شخصیات میں سے ایک ڈاکٹر خدائیداد تھا۔ جو چند روز قبل تک ہم میں موجود تھا، مگر آج نہیں ہے۔

اس نے اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ ''علم'' اتنا بانٹا کہ سب کو مالا مال کر دیا اور پھر اس کے پاس خود بھی یہ دولت بڑھتی چلی گئی۔ وہ جتنا بانٹتا اس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا، اس کی علم کی پھیلائی روشنی تاریکیوں میں اُمید کی کرن ثابت ہوئی۔ بلوچستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کی ابتدا جن نا مساعد اور ناگفتہ بہ حالات میں ہوئی اس میں تحریکِ آزادی کی جنگ اور اس سلسلہ میں کی جانے والی جدوجہد اور ہمارے زمانے کے سیاسی، سماجی، لسانی اور تاریخی واقعات ایک الگ تاریخی داستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان حالات میں بلوچستان میں روشن خیالی کو فروغ دینے اور علم وشعور کی شمع روشن کرنے میں جن احباب نے گراں قدر خدمات انجام دیں ان میں ایک اہم ترین اور معتبر نام ڈاکٹر خدائیداد کا ہے۔

اُس کی یاد میں تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کا مقصد اسے خراج عقیدت پیش کرنا تھا، اور اس کے حوالے سے مل بیٹھ کر چند باتیں کرنا تھا۔ اس کا کام، اس کا حوالہ۔ تقریب کا انعقاد سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی جانب سے کیا گیا۔ تقریب کے سٹیج سیکرٹری عبدالکریم بریالئی اور نوشین قمبرانی تھے۔ صدارت پروفیسر نادر قمبرانی نے کی اور مہمانِ خصوصی عابد شاہ عابد تھا۔

اس موقع پر ادب وفکر سے تعلق رکھنے والی کئی شخصیات نے شرکت کی اور اہل فکر نے دل کھول کر عقیدت کے پھول نچھاور کیے۔ مہمان خصوصی اردو، پشتو زبان کے نامور شاعر اور پشتو اکیڈمی کے صدر عابد شاہ عابد نے ڈاکٹر خدائیداد کو پشتو ادب میں تحقیق اور تخلیق و تراجم کے حوالے سے جدید رجحانات کا حامل قرار دیا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر خدائیداد نے ''سُچا پشتو'' کے نام سے پشتو زبان میں ایک اہم کتابچہ لکھا۔ جو آج بھی ادب کے طالب علم کے لیے معاون ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر خدائیداد نے بلوچستان میں روشن خیالی اور ترقی پسندی کے رجحانات کو دوام بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تقریب کے صدر پروفیسر نادر قمبرانی نے ڈاکٹر خدائیداد کی جسمانی دوری پر افسوس کا اظہار کیا اور ڈاکٹر صاحب کی فکری اور تنظیمی صلاحیتوں کا تفصیلی ذکر کیا اور اس کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

محسن شکیل نے عبداللہ جان جمالدینی کا مقالہ پیش کیا جو ایک تاثراتی مضمون تھا۔ اس میں ڈاکٹر خدائیداد کی ابتدائی زندگی، تعلیم اور پھر عملی زندگی کے حوالے سے ضروری تفصیلات کے علاوہ اس کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری نے اس کے اور اس کے کام کے حوالے سے اسے زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ اس نے ڈاکٹر خدائیداد کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف

کرتے ہوئے اسے بلوچستانی تاریخ کا اہم حصہ قرار دیا۔اس نے پشتو زبان کی ترقی وترویج کے حوالے سے بھی ان کی خدمات کا ذکر کیا۔اس نے کہا کہ : بلوچستان میں زندگی بے مہر ہے، ایسے میں اُمید کی کرن ڈاکٹر خدائیداد جیسے لوگ ہیں اور انہیں کسی بھی صورت میں ''موت اور فراموش'' والے محاورے کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے اس کی زندگی کے حوالے سے کہا: اس نے اپنی مرضی سے انتہائی پرآسائش زندگی سے گریز کرتے ہوئے سادہ زندگی کا انتخاب کیا اور سچے عاشق کی طرح زندگی سے پیار کیا۔ ہر لمحے میں پوری زندگی گزارنے کی کوشش کی۔ وہ خوش اور مطمئن شخص تھا۔ اسے زندگی سے پیار ضرور تھا مگر وہ کبھی موت سے نہیں گھبرایا بلکہ اس نے بہت وقار اور شان سے موت کا مقابلہ کیا اور آخری لمحوں میں بھی موت نے اس کے ماتھے پہ کبھی شکن نہیں دیکھی۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جنہیں یاد کیا جائے کیونکہ یاد انہیں کیا جاتا ہے جو کبھی ہم سے فراموش ہوئے ہوں، ڈاکٹر خدائیداد پہلے کی طرح آج بھی ہم میں موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

پروفیسر سیال کاکڑ نے کہا کہ ڈاکٹر خدائیداد کی شخصیت کا اتنے کم وقت میں یا ایک ہی نشست میں احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ وہ پہلو دار شخصیت کا حامل تھا، اس کے زیرِ سایہ کئی لوگوں کی تربیت ہوئی۔ سیال نے پشتو زبان کے حوالے سے، اور اس کی ترقی کے حوالے سے اس نے جو اقدامات کیے یا کام کیے اس کا ذکر بھی کیا جس میں پشتو مجلّہ فہرست تھا۔ اس کے علاوہ پشتو اکیڈمی سے اس کی وابستگی اور رسائل میں پشتو زبان اور پشتو ادب کی اشاعت میں باقاعدگی اسی کی مرہونِ منت ہے۔اس نے اس کی شخصیت کے حوالے سے کہا کہ وہ شریف النفس انسان تھا، اسے اپنے عقیدے سے پیار تھا اور اس نے صحیح معنوں میں خونِ جگر سے اپنے عقائد کی آبیاری کی اور مرتے دم تک اپنے عقیدے پہ قائم رہا۔ اس نے ڈاکٹر خدائیداد کے حوالے سے مزید کہا کہ جب تک افکار کی جنگ جاری ہے یہ دنیا قائم ہے، وہ زندہ رہے گا۔

ڈاکٹر عبدالرزاق صابر نے ڈاکٹر خدائیداد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اس کی علمی و ادبی خدمات کو سراہا۔ اس نے اس کی زندگی اور اس سے اپنی محبت اور قربت کا حوالہ بھی دیا۔ اس نے ریڈیو کے لیے بہت کام کیا اور کئی ڈرامے بھی لکھے۔ اگر انہیں یکجا کر کے کتابی صورت دے دی جائے تو بہت اہم کام ضائع ہونے سے بچ جائے گا اور اس سے نئے لکھنے والوں کو بہت کچھ سیکھنے کا بھی موقع ملے

گا۔ عطا اللہ بزنجو نے آغا گل کا مقالہ پیش کیا۔ نصیب اللہ بڑیچ نے ڈاکٹر خدائیداد کے بہت قریبی دوست کمال خان شیرانی کا پیغام پشتو زبان میں پیش کیا۔ سلیم کرد نے اظہار عقیدت کے لیے ڈاکٹر خدائیداد کی فکر کے حوالے سے پیراگراف پیش کیے۔

سرور آغا نے بعنوان ''میری قلندری کم نہیں کسی کی سکندری سے'' اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر خدائیداد کے خاندانی پس منظر، اس کی سیاسی کاوشوں، سیاسی خدمات اور سیاسی پس منظر کا ذکر کرنے کے علاوہ ''خاکسار تحریک'' کا حوالہ بھی دیا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر خدائیداد کو کئی زبانوں پہ عبور حاصل تھا، وہ کم گو، مگر صاف گو تھا۔ اندازِ گفتگو سنجیدہ اور دلنشین تھا۔ وہ استحصال کے خاتمے کے لیے اور اقتصادی ترقی کے لیے مارکسی فلسفے کا حامی رہا۔ اس نے عارفانہ زندگی گزاری، کبھی معاشی بدحالی کی شکایت نہیں کی۔ اسے جنگ، قتل و غارت، فرقہ واریت، دہشت گردی، غربت، جہالت، اور عداوت سے نفرت تھی۔ شوکت ترین نے پشتو زبان میں ڈاکٹر خدائیداد کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ فاروق سرور نے ڈاکٹر خدائیداد کے حوالے سے کہا کہ وہ برابری کا معاشرہ چاہتا تھا۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے والا درویش تھا۔ خواہشوں کا کوئی طویل سلسلہ نہ تھا جس کی تکمیل میں زندگی گزر جاتی ہے اور احساس تک نہیں ہوتا۔ اسے اندھیرے سے نفرت تھی، جہالت اس کے نزدیک کبھی نہ ختم ہونے والا اندھیرا تھا۔ فاروق سرور نے اس کے لکھے ہوئے ڈراموں کا بھی حوالہ دیا۔ سلطان قیصرانی نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر خدائیداد کی زندگی اور تاحیات علمی وادبی خدمات کے حوالے سے جدوجہد کا تفصیلی ذکر کیا۔ اس کی تحریروں کا احاطہ کرتے ہوئے خصوصاً تراجم کی مناسبت سے کئی نئے پہلوؤں کو نمایاں کیا۔

سال 2005

فروری:

جشنِ عبداللہ جان جمالدینی

سوشلزم فرد کی اہمیت کو اہمیت دیتے ہوئے بھی مرشد سازی کی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔
اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کی تیسری دنیا تنظیم اور پارٹی جیسے عوامی اداروں سے تقریباً محروم کردی گئی

اوراس پہ ایک ایسی ''جمہوریت'' انڈیل دی گئی ہے جس میں پورا معاشرہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی آزادانہ منافع کاری کی مطابقت میں ڈھال دیا گیا ہے۔ پیسہ بٹورنے کا گلا کاٹ ڈالنے والا مقابلہ ہی اصل جوانمردی کا میدان بن گیا ہے۔وارلارڈز، انتظامیہ، عدلیہ اور مقنّنہ کے مکمل طور پر مالک قرار پاگئے ہیں اور ایک ایسا سیاہ پس منظر قائم ہو چکا ہے جب آس پاس اور خود بلوچستان کے اندر عمومی پسپائی، مایوسی، بدامنی، اجداد پرستی، اور مردم آزاری کا پرچم سر بلند ہو چکا ہے۔تقریباً سارے کے سارے دانشور اسی فضا کی آبیاری میں بقادیکھ رہے ہیں۔ایک ہی قوت کے دو حصے ہو کر آپس میں غرانے میں عوامی قوتیں بھی اسی منصوبے کا حصہ بن چکی ہیں۔ بلوچستان کی تقدیر بھی کراچی کی طرح صرف دو نکتہ ہا کے حوالے کر دی گئی ہے: مشرف حمایت تحریک یا پھر متحدہ قومی موومنٹ۔

سماجی بنیادی تضادات پر مباحث موقوف ہو چکے ہیں، زورآور اشاعت گھر بلوچستان میں زرعی اور چرواہی معیشت کو نصاب بدر کر چکے ہیں۔ پوشاک بدل بدل کر ضیائی فلسفہ کو دوام دیا جارہا ہے۔اور بلوچستان کو صنعتی سمت پکڑنے میں خندوقوں، چٹانوں، غل غپاڑے، دھندو کہر سے دوچار کر دیا گیا ہے۔تمدنی مراکز اندھیارے کی عبرت گاہیں بنے ہوئے ہیں۔

اسی پس منظر میں نوجوان نسل کو روشن فکری، آدم دوستی، عالمگیر محبت اور سماجی انصاف کا متبادل دکھانے کی امیدیں ابھی ختم نہ ہوئیں کہ یہ قافلہ مضمحل و منتشر تو ہے، مکمل طور پر معدوم نہیں ہے۔ اوراس قافلے کا حوصلہ بڑھانے'' ''شاباش شاباش'' کہنے، ''ہمت کرو، آگے بڑھو'' چلاّنے والے لوگ ژوب میں سلیازی، سریاب میں فیض آباد اور لاہور میں ٹمپل روڈ پر طبعی طویل عمری کے نیم شل اعضا کے ساتھ بھی مشعلوں کی صورت موجود ہیں، زندہ ہیں۔ یہ لوگ ہماری تحریک کے غلطیوں بھرے دیروز، ازسرِ نو جائزوں تجزیوں اور صف بندیوں سے مامور ہماری تحریک کے امروز، اوراس تحریک کی واضح سمتوں پہ عالمِ انساں کے قدم بہ قدم وقار کے ساتھ چلنے والے افراد کے بیچ ربط ہیں۔ یہ ربط ہمیں بہت عزیز ہے کہ ہماری اپنی شناخت اسی کارواں سے ہے۔

اگر چہ عبداللہ جان پیر نہیں ہے تو اس کے ساتھی کہاں سے سجادہ نشیں ہوں گے۔اس لیے اسلام آباد کے افتخار عارف نے جمالدینی کے لیے تقریب منعقد کرنے کا خیال پیش کیا تو بس ایک فریضہ ہی ادا کیا، اس کے نام کی تسبیح پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب بیجنگ میں شرفِ انسان کے

قافلے کو''باجین'' کی 101 ویں سالگرہ پر گلدستوں کے انبار سجائے دیکھا تو اپنے باجینوں کی پذیرائی کا عزم کر لینا کونسی ایسی انہونی بات ہے۔اور جب لاہور کے پنجابی کامریڈ پوچھیں کہ ''ہمارے'' جمالدینی صاحب کا کیا حال ہے؟ تو اس کے جواب میں یہ معاہدہ ہونا کہاں بعید از قیاس رہ جاتا ہے کہ '' تم میرے سی آر کا خیال رکھنا، میں تمہارے جمالدینی کی خدمت کروں گا''۔

سو جشنِ عبداللہ جان جمالدینی کا انعقاد یقینی ٹھہرا۔

محترم عبداللہ بلوچ نے حسبِ معمول آرٹس کونسل کا عطا شاد آڈیٹوریم ہمارے حوالے کر دیا۔حسبِ معمول اس لیے کہ سنگت اکیڈمی آف سائنسز نے آج تک جتنی بھی تقریبات منعقد کیں، سب اسی ہال میں اسی عبداللہ بلوچ کی معاونت سے سرانجام دیں۔اس بار ماما عبداللہ جان جمالدینی جشن کے پروگراموں میں سنگت اکیڈمی کی جوڑی دار افتخار عارف کی اکیڈمی ادبیات بنی اور بلوچستان شاخ کے اس کے سربراہ جناب افضل مراد اس کا سرگرم منتظم۔

عبداللہ جان 83 برس کا بوڑھا شخص ہے، اس کا بایاں پیر اور بایاں ہاتھ مفلوج ہیں۔ ہم گزشتہ پندرہ برس سے ہر ہفتہ وار تعطیل کے دن اس کے ہاں جمع ہوتے ہیں۔اس کی عیادت کے لیے، اسے کمپنی دینے کے لیے، اور یہ روزِ اول سے طے ہو گیا تھا کہ اس کی محفل میں کوئی سخت یا پیچیدہ بحث نہیں کرنی ہے۔سو فیصد ہلکے پھلکے موضوعات، اور ہنسی مزاح پہ مشتمل یہ محفلیں آج تک اسی ایجنڈے پر چل رہی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اسے بلڈ پریشر ہے اور وہ جذباتی طور پر زود اثر لینے والا بن چکا ہے۔ جب بہت جذباتی ہوتا ہے تو بلڈ پریشر بہت جلد شوٹ کر جاتا ہے۔لہٰذا یہ غلط فہمی دور ہونی چاہیے کہ بلوچستان سنڈے پارٹی کوئی ایجنڈے دار اکھٹ ہے یا ہم جمالدینی صاحب سے سیکھنے سکھانے جمع ہوتے ہیں۔قطعاً نہیں۔ہم صرف اپنے ''ساتھی'' کی دلجوئی، عیادت اور اس کی ٹائم پاسی کو جاتے ہیں۔ بقیہ حاصلات تو ''بائی پراڈکٹ'' بھی ہیں اور ناگزیر بھی۔

اس بیک گراؤنڈ میں عبداللہ جان کو بلانا اور اس ہال میں بٹھا کر اُس پہ مقالہ بازی جیسے بہت ٹھیٹھ اور سنجیدہ جرم کا شاہد و ناظر و سامع بنانا واقعتاً خطرناک عمل تھا۔اس پہ کسی بھی وقت رونے یا جذبات سے تھر تھر کانپنے کا دورہ پڑ سکتا تھا۔ پھر اسے دور سریاب سے وسطِ شہر لانا، گاڑی سے اتارنا چڑھانا اور سخت سردی میں لاؤڈ اسپیکر کے ہاؤ ہو میں بٹھانا انتہائی مہم جوئی تھی۔اس پہ طرہ یہ کہ جیسے جیسے

جذباتی باتیں زیادہ ہوتی جائیں، اسے پیشاب کا دورہ تیز تیز پڑنے لگتا ہے۔ اور اس معذور بزرگ سن، شریف آدمی کو بار بار ہال سے باہر آنے جانے کا گناہ بہرحال صغیرہ نہ تھا۔ اس شش و پنج میں اور بھی لوگ آخری گھڑی تک مبتلا رہے۔ ماما کے اہلِ خانہ شدید طور پر اس مہم جوئی کے خلاف تھے۔ بالخصوص ہماری محترمہ مامی (جنہیں سائیں کمال خان ''کا مریڈہ'' کہتا ہے) تو اس آئیڈیا کی شدت سے مخالف تھی۔ خود ماما بھی پیر پرستی کے اس ''دکھاوے'' سے دبے لفظوں میں ہم سے احتجاج کرتا چلا آیا تھا۔

ہم سب بلوچستانی اپنی ساری زندگانیاں ''اللہ بھروسے'' پر بتاتے چلے آرہے ہیں، سو ایک بار پھر اللہ کا نام لیا اور طعن و تنقید، احتمال و خدشات اور ''اگر''، ''تو'' کی گردان کے گرداب سے گزر ہی گئے اور چھ فروری پہنچ ہی گیا۔ اذیت ناک بات یہ تھی کہ شدید ترین سردی کا نزول تھا اور بارش و ژالہ باری کا کاک ٹیل تیار۔ حاضرین کو شہر کے کونے کونے سے آرٹس کونسل پہنچنا تھا۔ معروض چونکہ ہمیشہ سے اونچی خواہشات کا منہ چڑاتا آیا ہے، چنانچہ آج بھی شدید سردی، ژالہ باری اور لوگوں کی پختہ عادتوں کے ہاتھوں کہیں سوا چار بجے جا کر اس قابل ہوگئے کہ ماما کے فرزند کو ماما کو لے آنے کا فون کرسکیں۔ برستی بارش و گرتے ژالے میں چھجوں کے نیچے کھڑے ہو کر کبھی مہمانوں کا استقبال کرتے اور کبھی چوری چھپے ہال کے اندر مردم شماری کی ''آئی ایس آئی'' گیری کرتے۔ پندرہ سے بیس ہوئے، پھر پینتیس، بیالیس، اکیاون ....

ماما عبداللہ جان کی گاڑی آئی، پون صدی اسے اترنے میں لگی اور اس دوران ہال بھر گیا .... جی ہاں دوستو! ہال بھر گیا۔

ماما نے گاڑی کا دروازہ کھلتے ہی مجھے مامی کی ناراضگی والی دھمکی دے ڈالی، شرارتی وغیرہ وغیرہ کہہ دیا۔ منتظمین نے ان پہ گلاب کے پھول کی پتیاں برسانی شروع کردیں۔ پہلی سیڑھی، دوسری سیڑھی، تیسری اور .... چوتھی سمجھ میں آ گیا کہ مجھ سے فاش مہم جوئی سرزد ہو ہی گئی۔ ماما باقاعدہ Collapse ہونے کی حد تک مضمحل ہوگیا۔ پانچویں پہ اس کا ڈنڈا ہٹا کے کندھوں کا سہارا دے دیا۔ اگلی دو تین سیڑھیوں پر جتنی بری باتیں جتنی بھی زبانوں میں یاد تھیں، اپنے پہ انڈیل ڈالیں۔ ہانپتا ہانپتا بوڑھا محبوب پھولوں پر چلتا ہوا، سہاروں، حوصلہ افزائی کے جملوں میں، تالیوں کی بازگشت میں، پورے ہال کے احتراماً ایستادہ رہنے کی فضا میں گیٹ کے ساتھ والی پہلی نشست پہ دھڑام

سے بیٹھ گیا۔ بلوچی میں دم آ جانے والی ایسی گھڑی کے لیے فقرہ استعمال کرتے ہیں:

''آسمان واپس چلا گیا اوپر اور زمین آئی اپنی جگہ پہ''۔

یقین کیجیے قارئین! کہ ہمیں اس گھڑی کے خیر سے گزرنے کے بعد کچھ پرواہ ہی نہیں رہی کہ کون دوست کس حسین انداز میں عقیدت کے پھول نچھاور کر رہا ہے میرے سینئر ساتھی پہ۔ تا آنکہ ایک مقرر دوست نے تنقید کی ایک بوچھاڑ ماردی۔ سنگت اکیڈمی کا نام لے کر کہ اس نے اس بار کس سرکاری ادارے کو اور وہ بھی مرکزی سرکاری ادارے کو اپنے ساتھ پروگرام میں نتھی کرلیا ہے۔ دل نے چاہا کہ محترم مقرر کو بتاؤں کہ 58 برس کی ہماری تاریخ میں پاکستانی سرکاری ادارے خواہ وہ مرکزی ہوں، صوبائی ہوں، یا نیم خود مختار، ماسوائے جہالت، عوام دشمنی اور امریکی چپڑاسی گیری کے کچھ کرتے ہی نہ رہے۔ اور اکیڈمی خواہ لیٹرز ہو یا بلوچی جا کر دیکھیے ان کے ریکارڈ میں ضیاالحق کے زمانے میں اسلامی سبزیاں، اسلامی پوشاک نام کی اشاعتیں آپ کو نظر آئیں گی۔ جب حکومت رجعتی اور فیوڈلوں کی ہو تو ادارے بھی وہی کرتے ہیں۔

ہمیں اکیڈمی آف لیٹرز سے نہ کل کوئی محبت تھی اور نہ آنے والے کل کوئی اچھی امید۔ یہ تو بس ایک آدھ آدمی آ جاتا ہے جو کچھ بہتری لاتا ہے، دو چار برس گزارتا ہے اور ایک دو مزید برسوں کے لیے اُس فرسودہ ادارے کو عوامی عزت بخش جاتا ہے۔ ان میں سے ایک محترم فخر زمان تھا جو دو تین برس رہ پایا اور ایک افتخار عارف ہے جو تمام حفیظ جالندھریوں، یوم کشمیر وغیرہ وغیرہ کے بیچ کہیں عبداللہ جان کو بھی اڑس لیتا ہے اور پھر یہ آئیڈیا ہی اسی افتخار صاحب کا تھا۔ اسی شخص کی خاطر معزز مقرر کی ناگوار باتیں بھی گوارا۔

روشن خیال، بشر دوست اور مساوات نواز انسانوں سے ہال بھر گیا۔ کچھ شناسا کوئی انجانا، کوئی شہری، کوئی دیہاتی پگڑ پہنے، جس نے دس آدمی ساتھ لانے تھے وہ خود تک نہ آیا، جس کے آنے کی بالکل توقع نہ تھی وہ سب سے پہلے آیا اور سب سے آخر میں اٹھا۔ اجتماعات کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔

محسن شکیل ''جشن عبداللہ جان'' کی پہلی نشست کا میزبان ٹھہرا۔ یہ نشست مقالے پڑھنے کی تھی۔ مقالہ خوانی سب سے نازک مرحلہ اس لیے ہوتا ہے کہ ثقافتی سرگرمیوں کے قحط میں جب

ہمارے دانشور کو کبھی کبھار برسنے کا موقع مل جاتا ہے تو وہ شادی کو رڈیم کو تہس نہس کر جاتا ہے، وہ پانچ منٹ کی بجائے پچیس منٹ لے لیتا ہے اور بقیہ سکالرز کا حق مارنے کے ساتھ ساتھ ساری محفل کا توازن بگاڑ ڈالتا ہے۔ اسی لیے کشتی کا ناخدا کسی چو این لائی کو مقرر کرنا پڑتا ہے کہ کوئی طالع آزما اڑتے وقت کی گردن کو اپنے پیروں تلے کچلنے کی خودکشی نہ کر سکے۔ محسن نہ صرف خود اچھا شاعر ہے بلکہ ایک منجھا ہوا ساتھی اور اچھا منتظم قسم کا اسٹیج سیکرٹری بھی ہے۔ وہ ماضی میں بھی ''بزنجو امن تقریبات'' کی پائلٹی کرتا رہا ہے۔ وہ سنگت اکیڈمی کے اچھے رفقا میں سے ہے، سرور آغا کے میٹھے چاولوں کا جوڑی دار ہے اور روشن فکری کا رضا کار۔

تعارفی کلمات کے بعد سٹیج سیکرٹری نے بزنجو ماما کے دیرینہ سیاسی رفیق، سابقہ پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے صوبائی صدر اور معمر علمی ادبی شخصیت جناب سیف الدین بوہرہ کو مہمان خصوصی کے بطور بلایا۔ کتنا بدقسمت معاشرہ ہوگا جس میں نوجوان نسل اپنے قافلے کے سینئر ترین بزرگ کو مہمانِ خصوصی بنانا چھوڑ دے! دوسرا مہمان معروف شاعر جناب سرور جاوید تھا جس کے طرفدار ہم اسی روز ہوگئے تھے جب بلوچستان کے محبوب اور وفادار بیٹے سید امیر الدین کے ماتمی جلسہ میں اسٹیج سیکرٹری ہونے کی سکت کسی اور میں نہ تھی، جو شخص بھی عوامی ماتم کا سٹیج سیکرٹری بنے گا وہی تو عوامی جشن کی صدارت کو کوالیفائی کرے گا۔ یہی ہے نا اصول انسانی قافلے کا!!۔

جشن عبداللہ جان کی صدارت کے لیے پروفیسر نادر قمبرانی کے مقابلے میں پورے بلوچستان میں صرف ایک امیدوار ہے اور وہ ہے سائیں کمال خان شیرانی۔ مگر ایک تو وہ ہمارے دلوں کے اندر بستے ہوئے بھی دو سو میل دور ژوب میں گوشہ نشینی کر کے سلطانی کرتا ہے اور اگر شہر میں ہو بھی تب بھی اسے صدارت (حتیٰ کہ جلسے کی صدارت) کرانے کے لیے راضی کرنے میں اس کے کسی قریبی ساتھی کو اپنی دیرینہ اور قریب ترین رفاقت رہن رکھنی پڑتی ہے۔ چنانچہ حقدار کو ہی صدارت کی کرسی ملی جس کے لیے کسی سترہویں ترمیم کو نہ سوٹی کی ضرورت پڑی نہ روٹی کی۔ نادر نے یہ توشہ تو اپنی جان ظاہر شاہ و ایوب خان کے نیشوں میں دیے رکھا۔ ہم بہت چھوٹے لوگ تھے مگر عصر نے عصر کے بڑے ستاروں کی انگشتِ رہنمائی تھما کر ہمیں کتنا بڑا کر دیا ہے!۔ نادر نحیف و ناتواں قدم اٹھاتے برسوں کی قربانیوں کا کہکشاں نقش کرتے اسٹیج تک پہنچا۔

ڈاکٹر خدائیداد جب زندہ تھا تب بھی محفل کے خاتمے پر ہی جنبشِ چشم کے ذریعے شاباشی دیا کرتا تھا، اب کے بھی جشن کے کامیاب انعقاد پر ہی مرنے سے لے کر آج تک پہلی بار خواب میں نظر آیا (ایمان کی سلامتی کی سند لینا بہت صبر آزما کام ہے)۔ امیر الدین کی غیر حاضری تو ہمارا بایاں کندھا، اپنے ساتھ والا خلا دیکھ کر ہر وقت جتا تا رہتا ہے، مشاعروں میں اس کی کھلنڈری آنکھوں کی غیر حاضری نے کبھی ہماری آنکھوں کو نہ دہلایا۔ ماما کا دیرینہ ساتھی مستری محمد غوث زندہ ہوتا تو ضرور گالیوں بھری عوامی زبان میں قہقہے اگلوا ڈالنے والی تقریر کر جاتا۔ عزرائیل کی جیل میں ''پیرول'' کا بھی رواج نہیں!! ایک ایک جام تم سب بچھڑنے والے ساتھیوں کے نام!۔

افراد نے، اداروں نے، انجمنوں نے بڑے عبداللہ جان کو پھولوں کے گلدستے پیش کیے، شیلڈ و تحفے دیے، چادر و شال پیش کیے، جی ہاں دوستو! بلوچستان اپنے دانشور کی بہت عزت کرتا ہے۔

گل بنگلزئی زبانی بولا، دو چار فقرے............ لیکن سُچے، خالص فقرے، ہم نے جشنِ جمالدینی پہلی بار تھوڑی منعقد کیا!۔ ایک دفعہ پہلے والا ایک جشن میں مجھے یاد ہے جس میں گل صاحب نے ایک فقرہ بولا تھا، پتہ ہے کیا، ''بس، بس عبداللہ جان میرا بھائی ہے''۔

عزیز بگٹی نے ماما جمالدینی کو نوجوانوں کی طرف سے عطا کردہ لقب ''ماما'' کے رشتے کی گہرائی بیان کی۔ (مزید کچھ بولنے کی اسے کیا ضرورت تھی)۔ رزاق صابر اپنی شاگردی بیان کر گیا، سرور جاوید کا تحسین بھی ماما کے لیے فی البدیہہ تھا۔ وحید زہیر کے مقالے میں تالیاں ہی تالیاں ہیں۔ شاعری کرتا ہے نثر میں۔ چابکیں مارتا ہے ''ثقافت و غیرت'' پر۔ کبھی نشتر چلاتا ہے، کبھی انجکشن چبھوتا ہے، کبھی فیوڈل بلوچستان میں سماجی تبدیلی لاتا ہے، کبھی ماما جیسی شخصیات کے حوالے سے روشن فکری پھیلاتا ہے۔ سرکاری نوکری نہ کرتا تو سیاست کا سیکرٹری جنرل ہوتا۔

ننگر چنا سسی کے دیس سے بلوچستان آیا ہوا ہے۔ اس کی سوچ سندھی دوستوں نے وہیں سے پلٹ دی تھی۔ ریڈی میڈ سنگت ہے یہاں کا۔ اس پہ نیشنلزم کے دورے پڑنا معروض کی اپنی کج روی ہے۔ روشن فکری کے سمندر میں نہ گوادر ''کا'' خطرہ ہوتا ہے، نہ گوادر ''کو'' خطرہ ہوتا ہے۔ چنا نے سائیں لطیف کی خیر و خیر سگالی کی پیغمبرانہ باتیں بلوچستان میں پھیلا دیں تو وہ بڑا آدمی بڑا جدلیاتی لگا، ہم جدلیاتی لگے، ہمارے ساتھی جدلیاتی لگے۔ (غیر جدلیاتی کو بے سُرا کہتے ہیں ناں!)۔

عبدالکریم بریالی ہمیشہ کی طرح اب بھی بہت محنت سے اپنا مقالہ لکھ کر لایا تھا۔ بہت خوشی ہوتی ہے محنت سے لکھے ہوئے مقالے کو مقررہ وقت کے اندر سننے کی ۔ بریالی نے دونوں کام کردکھائے۔ اچھا مقالہ اور مقررہ وقت کے اندر اندر۔ اس بار اس نے گلہ کا موقع نہ دیا۔ اس کے مقالے کا لب لباب یہ تھا کہ اگر آئیڈیل بلوچ دیکھنا ہو تو عبداللہ جان کو دیکھیے ۔ ہم حیران کہ اگر عبداللہ جان آئیڈیل بلوچ ہے تو ہم تو خیر گئے ہی ہیں کام سے، اصلی تے وڈے آئیڈیلوں کا کیا بنے گا ؟۔ بریالی خدا کو مانو، رعایت کرو، یہ یارڈ سٹک، یہ معیار بہت سخت ہے۔

ڈاکٹر عطااللہ بزنجو نے ماما کے ارشادات پہ مشتمل اپنا مقالہ پڑھا۔

افضل مراد نے شاعری میں ماما کو نرم لہجے کی ردا قرار دیا۔ زینت ثنا نے لاہور کی محترمہ استاد اور عوامی شاعرہ محترمہ شبینہ رفعت کی نظم پڑھی جو اس نے لاہور سے بھیجی تھی افضل مراد کو۔ ماما کے دوست کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں، ماما کے ہم فکر کہاں کہاں روشنی کیے ہوئے ہیں !!۔

زینت نے یہیں بس نہیں کی بلکہ اپنے پرس سے ایک عدد مکمل و مفصل مقالہ، نکالا اور کسی کی پرواہ کیے بغیر ٹکا کے پڑھ لیا۔ اور آخر تک پڑھ لیا۔ سامعین جائیں بہشت میں !۔ محترمہ نے یونیورسٹی میں ماما کی ملازمت کے زمانے کی خدمات کا ذکر کیا اور خواتین کی تعلیم کے حق میں اس کی جدوجہد کا تذکرہ کیا۔

پروفیسر شرافت عباس نے تعریف کے لائق انسان کی تعریف کی ۔ کچھ نثر میں، کچھ نظم میں ۔ فارسی کے اس خدمتگار نے بہت وقت دیا بلوچستان کو۔ اس کی تو فارسی زبان ہی بخشش کرا دے گی ۔

بیرم غوری نیم پیرانہ سالی اور نیم جوانی میں اپنے لیے بہت ہی سراہنے والے پیدا کر چکا ہے۔ مختصر وقت میں بہت اچھا مقالہ لکھ لایا تھا وہ ۔ اس نے مادی معاشرتی ترقی کو فرد کی ترقی سے جوڑنے پہ زور دیا۔ سرکار سنے تو ؟ ۔

ایک عدد مقالہ میں نے بھی پڑھا۔

پشتو فولکلور کا چلتن پہاڑ، سیال کاکڑ آیا۔ ماما عبداللہ جان کے ساتھ یونیورسٹی میں ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں استادی کرنے والے اس پیر مرد کا لکھا ہوا مقالہ بہت پسند کیا گیا۔ معلومات بھری باتیں ہوتی ہیں اہل علم کی، اور علم کے خزانے ہوتی ہیں ان کی محفلیں ۔ سیال کی عمر طویل، اور دماغ اسی طرح

زرخیز رہے۔

عابد شاہ عابد کو نکالو تو پشتونوں کا نرم لہجہ، مسکان، اور خلوص و خیر بھری صورت مدھم پڑ جائے۔ ہمارے اس بزرگ کا والد ماما کا دوست تھا۔ ایک بہت ہی برجستہ، زبانی تقریر تھی اس کی ، متوازن سی شگفتہ سی ۔ ہمیں عابد شاہ عابد اچھا لگتا ہے۔

سیف الدین بوہرہ اپنی بیماری اور پیرانہ سالی کو ایسی کی تیسی کہتے ہوئے نہ صرف یہاں تک آیا تھا بلکہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر مہمانِ خصوصی والی کرسی پر بھی بیٹھا۔ لکھ کر لایا تھا اپنی تقریر اور بہت سادہ بہت سیدھا بہت دلکش مقالہ پڑھا۔ تھوڑی تھوڑی علمیت ،تھوڑا تھوڑا مزاح اور پیرانہ سالی۔ علامہ اقبال کی مشہور نظم '' بچے کی دعا'' کو اس نے بالکل ہی نئے طرز کے معنی پہنائے ، حالانکہ اس نے کہا کچھ بھی نہیں، بس وہ نظم پڑھی۔ اس نے ہم سب کو بہت توجہ سے سننے پر مجبور کیا۔

پروفیسر نادر قمبرانی سر قبیلوی نظام کو مسترد کرتے ہوئے ماما کی رفاقت میں اپنی سیاسی جدوجہد کی خاکہ کشی پہ اتر آیا۔ انسان دوستی کے سفر میں اپنے اس ہم سفر کو اس نے بہت سراہا۔ اس نے سنڈے پارٹی کے بارے میں بھی باتیں کیں جو حاضرین کے لیے دلچسپی کی حامل تھیں ۔

ماما عبداللہ جان تو سیڑھیاں چڑھ کر مائیک پر نہ جا سکا تھا پر مائیک خود چل کر اس کے پاس آیا ۔ اور ماما جب بول رہا تھا تو اس کا منہ حاضرین کی طرف نہ تھا۔ ایسی تقریب آپ نے دیکھی پہلے؟ مقرر ،حاضرین سے پشت کیے بیٹا ہوا تقریر کر رہا ہو !!۔ علم کے موتی تھے جو بکھر رہے تھے اس کی زبان سے ۔ بہت مختصر مگر سعدی ، رومی ، حافظ دوبارہ زندہ ہو چکے تھے اس کی زبان سے ۔ اس نے علم سے اپنی محبت کا اس زور شور سے اور اس سادگی سے اظہار کیا کہ عبداللہ جان کی عبداللہ جانی ثابت ہوگئی۔ سائنس کے تقدم اور سائنسی علوم کی بالادستی کو اس نے عین انسانیت قرار دیا۔

ماما کو بخیر و امن و حفاظت گاڑی پہ بٹھا کر رخصت کیا اور واپس ہال میں آ گئے ۔ جہاں پہ چائے اور بسکٹوں کا وقفہ ہوا تھا۔ لوگ دبا کے کھا رہے تھے، پی رہے تھے، بحثیں کر رہے تھے، تبصرے کر رہے تھے، ایک دوسرے کو فون نمبر دے رہے تھے۔ ہم ایک مایوس جامد اور ساکت شہر میں ہلچل سے بھرپور زندگی دیکھ رہے تھے........... پانچ گھنٹے کے لیے ہی سہی۔

ہم نے اگلے لمحے خود کو عطا شاد کے آڈیٹوریم میں اس طرح پایا کہ اب بھاری بھرکم

شخصیات جا چکی تھیں، جواں دلوں اور عمروں کے لوگ رہ گئے تھے۔ جو ہال کا 50 فیصد حصہ تشکیل دے رہے تھے۔ بین اللسانی امن مشاعرہ منعقد ہونے والا تھا۔ یہ امن مشاعرے ہمارے ہر تقریب کی ایک شناخت رہے ہیں۔ ہم اس بار کتابوں کی رونمائی والا کام نہ کر سکے۔ بس سستی ہوگئی۔

اردو کا ممتاز ادیب، شاعر، کالم نویس اور کالج استاد پروفیسر عرفان بیگ اس امن مشاعرے کا میزبان تھا۔

اس نے پشتو زبان کے معروف شاعر شفیق معذور یار کا نام صدرارت کے لیے پکارا۔ ہمارا یہ اچھا شاعر نابینا ہے۔ اردو کا بہت خوبصورت شاعر اور نامور دانشور بیرم غوری مہمان خصوصی بن گیا۔ وہ بلوچستان یونیورسٹی میں لوگوں کو صحافت میں ایم اے اور ایم فل کرواتا ہے۔

اردو کلام میزبان نے سنا کر ابتدا کی۔ سرور جاوید اردو شاعری کر رہا تھا، سعید کرد نے براہوی میں ماما کو خراج تحسین پیش کیا اور امن کو لوریاں دیں، ڈاکٹر علی دوست بلوچ بلوچی میں شعر سرا تھا، مومن معراج بلوچی میں غزل خواں تھا، محسن شکیل اردو شعر گوئی کی داد سمیٹ رہا تھا۔ افضل مراد اردو پوئٹری کر رہا تھا، تسنیم صنم خواتین کی نمائندگی کر رہی تھی اردو میں، سلیم کرد شیعہ سنی جھگڑے پر براہوی میں ماتم کناں رہا، بقا بلوچ نے اردو میں غزل سنائی، باری اسیر براہوئی میں شاعروں دانشوروں کو عمل پہ اکسا رہا تھا، نوید حیدر ہاشمی اردو میں، صادق مری اردو میں اور عدن عدیم اردو میں باری باری شاعری کرتے رہے، علی بابا تاج نے فارسی میں شعر پڑھے، افتخار نے اردو میں نظم پڑھی، ننگر چنا سندھی میں بیت خواں ہوا، شمس ندیم براہوئی، اور ناطق سولنگی نے اردو نظمیں پڑھیں۔

رپورٹ: شاہ محمد مری

ماہنامہ سنگت، فروری 2005

ستمبر:

بلوچستان کا ادب اور خواتین

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی سالانہ بزنجو امن تقریبات اس سال ایک نئی تبدیلی کے ساتھ منعقد ہوئیں۔ ہم ابھی تک یہ تقریبات، ان کے یوم وفات یعنی گیارہ اگست کو مناتے چلے آئے ہیں۔ جو قدرتی طور، غم اور ماتمی سا انداز لیے ہوتی تھیں۔ احباب کا خیال تھا کہ بلوچ عوام ویسے ہی ایک

دکھ بھری زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کی معیشت دکھ بھری ہے، ان کا بود وباش دکھ بھرا ہے، ان کا وطن دشوار گزار ہے، ان کی سیاست دکھوں بھری ہے، ان کے لیڈروں نے دکھ بھری زندگیاں گزاری تھیں۔ مگر بزنجو صاحب نے جیلیں، اور قلی کیمپ کی غیر انسانی تکالیف اور تشدد تو اس لیے سہے تھے کہ بلوچ عوام کی دکھوں بھری زندگی بدل جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ مسرتیں متعفن بنگلوں میں قید نہ ہوں بلکہ ساری خلقِ خدا خوش رہے، آباد و شاد رہے۔ لہٰذا ہمیں کم از کم اسی بڑے انسان کے نام پہ ہی انہیں مزید دکھی نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ حسب سابق میر صاحب کی برسی تو بڑی سادگی سے روایت وانسانی شرف کے مطابق منائی جائے۔ لیکن اس کے نام کی امن تقریبات کو اس کے یوم وفات سے آہستہ آہستہ دور کھسکا دیا جائے تاکہ لوگ چار چھ گھنٹے کے لیے ہی سہی مسکرا سکیں، جھوم سکیں، گا سکیں، بول سکیں۔

محترمہ فہمیدہ ریاض نامور شاعرہ ہے۔ بلوچستان کے عوام کی دوست ہے اور ترقی پسند سوچ رکھتی ہے۔ اس نے سنگت اکیڈمی آف سائنسز سے مل کر کوئٹہ میں خواتین کی سماجی پست حیثیت پر ایک سیمینار منعقد کرانے کی خواہش کی۔ ظاہر ہے ہم اس موضوع سے گہری وابستگی رکھتے ہیں اور سنگت کے کارواں کے نظریہ حیات میں عورتوں کی برابری ایک اہم نکتہ ہے۔ طے ہوا کہ ہم ان کی تنظیم ''وعدہ'' کے ساتھ یہ سیمینار منعقد کریں گے۔ چنانچہ وعدہ کا دو رکنی وفد ہم سے گفتگو کرنے کوئٹہ پہنچا۔ یہ دو رکنی وفد دو خواتین پر مشتمل تھا۔ فہمیدہ ریاض کی علم و دانش کی چاکری تو ہم عرصے سے کر رہے تھے، اب کے ایک اور باذوق و باعلم خاتون ان کے ساتھ آئی؛ فاطمہ حسن۔ کسی انسان کی پیشانی پہ بالادستی (ثقافتی، علمی، معاشی) کی بدنما لکیریں نہ ہوں تو اسے بلوچ کی دوستی فوراً میسر ہو جاتی ہے۔ سو ہماری دوستی یکدم ہوگئی۔ اور یہ دوستی بنی ہی اختلافِ رائے سے۔ اس کا خیال تھا کہ شاؤنزم کی حد تک خواتین کی بات کی جائے۔ جبکہ ہم چالیس برس سے قومی مسئلہ کو طبقاتی مسئلہ سے جوڑنے کی ناکام سعی میں فیوڈل دانشوروں کے طعن کے سائے میں پل کر جواں ہوئے ہیں، اس کی یہ بات کس طرح مان سکتے ہیں۔ کُل سے جز کو الگ کر کے ان کے باہمی تعلق سے چشم پوشی ہم سے نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا بات تو بنی نہیں، دوستی بن گئی۔ فہمیدہ نے فیمینزم اپنے ذمے لے لی اور یہ دو رکنی وفد یقین و بے یقینی کے ملے جلے جذبات کے تحت کوئٹہ بدر ہوگیا۔

مگر ان کے انہی دو تین دنوں کے قیام کوئٹہ میں ہمیں بے شمار نعمتیں ملتی ہیں۔ شاعری کی پیغمبرانہ جھلکیاں نصیب ہوتی ہیں، غمِ روزگار میں پیوست، صدیوں سے غائب چہروں کی دید ہو جاتی ہے۔ بزرگوں کی زیارت کا ایک اور موقع ملتا ہے، دوستوں کے بیوی بچوں کی خیریت جاننے کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے، نامکمل تحریروں کی تکمیل کے عزائم جاگ جاتے ہیں، دعوتیں اڑانے کا وقت مل جاتا ہے، محبتیں شفقتیں چننے کی خلعتیں نصیب ہوتی ہیں، خیالات کے تبادلے کے من وسلویٰ میسر ہوتے ہیں، کتابوں کے تبادلے ہوتے ہیں، زیرِ مطالعہ موضوعات شیئر کیے جاتے ہیں، ثقافتوں کی رنگارنگی ہم انسانوں کو باہم قریب لاتی ہے اور کئی نئے اہلِ علم خواتین وحضرات دریافت ہو جاتے ہیں، روٹین ٹوٹ جاتا ہے اور کولہو کے بیل والی دائراتی چکر بازی ختم ہو جاتی ہے............ ہم اس عارضی تبدیلی کا بچوں کی طرح جشن مناتے ہیں۔

اپنے احباب کی محنت اور کوشش کی توقیر ہمارے سر آنکھوں پہ مگر سچی بات یہ ہے کہ بزنجو تقریبات اپنی کامیابی خود ساتھ لاتی ہیں۔ انہیں کامیاب کرنے کے لیے کسی بڑی تپسیا کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کون انسان ہوگا جو عقل سلیم کی آذان پہ لبیک نہ کہے گا۔ اس کی تقریبات کے بارے میں لوگوں کو بہت زیادہ بتانا نہیں پڑتا۔ ہم دعوت نامے تو رسم کے تحت چھاپتے ہیں۔ اخبار میں اس کی تقریبات کے بارے میں چھپنا نہ چھپنا ایک جیسا ہے۔ لوگ خود ایک دوسرے کو خبر کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ہم خواہ مستی میں کتنے ہال ڈھونڈیں، عبداللہ بلوچ کا کشادہ سینہ ''ہاں'' کہنے کے لیے محض ایک فون کال کا منتظر رہتا ہے۔ ہر بات ختم، جب دو دن کے لیے آرٹس کونسل کا ہال ہمارے نام ریزرو ہو جاتا ہے۔ فارمیلٹی کے بطور ایک آدھ خط **سنگت** کے پیڈ پر یوسف بلوچ کو بھجوانا پڑتا ہے۔ وہ بھی اختیاری مضمون کے بطور۔ چنانچہ اس بار بھی وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ عزیزی سلیمان کاکڑ کی ''ہال تلاش'' مہم فوری طور پر رک جاتی ہے اور ہم دونوں بقیہ کاموں کی طرف لگ جاتے ہیں۔ زینت ثنا ایک ذمہ دار کوآرڈینیٹر کے بطور ہر جگہ ہر کام کو سہل بنانے موجود ہوتی ہے۔ میر عبداللہ جان جمالدینی خود کو صدارت ومہمانِ خصوصی گیری سے بچانے کی خاطر بڑی تن دہی سے ہمارے لیے ایک صدر کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ وفاقی یا صوبائی وزیر ہماری افتادِ طبع کی دسترس سے ہمیشہ سے دور رہے، کہ ان کے بندوق بردار امن تقریبات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ گورنر (سابقہ یا لاحقہ) ہماری تقریبات کے مزاج والے سامعین وحاضرین کے لطیف

احساس کو مکدر بنا دیتے ہیں کہ یہ لوگ بزنجو کی انجمن میں موجودگی کے لیے کوالیفائی ہی نہیں کرتے۔ خود ہم سی آر اسلم کی تربیت کی کارستانی سے الحمداللہ بڑی کرسی کی طرف پھدکنے کی صلاحیت سے ہی عاری ہو چکے ہیں۔ چنانچہ عالیہ اسما پہ ہی نگاہ ٹھہرتی ہے، میری بھی، ماما کی بھی۔ انہیں ایک خط لکھتا ہوں مودبانہ، بے باکانہ۔

ان کا جواب آتا ہے۔

''عزیزم ومشفقم، دعائے خیر

پیار وسلام............!

''مدتوں میں نے ایک ان بہے آنسو کو آنکھ کے بجائے دل وجگر کے گوشوں میں سموئے رکھا تھا۔ جو پورے بیس سال بعد آخر کار ٹپک کر شاہ محمد مری کی شکل وصورت اختیار کر گیا۔ جو میرے نزدیک موتیوں سے بھی سوا ہے۔ رہے ماما وہ تو بلوچستان بھر کے لیے گہر کا خزینہ ہیں۔ ان کے ''حکم'' اور آپ کی ''خواہش'' کی بدولت جو مقام مجھے مل رہا ہے وہ میری حیثیت سے بیسیوں اعلیٰ و بالا ہے مگر............ منٹو مرحوم نے جیتے جی اپنا کتبہ لکھ کر ایک نئی ریت وروایت قائم کی تھی۔ اسی طرح آپ بھی اس مرتبہ ایک نئی رسم ڈالیں یعنی بچھڑے ہوؤں میں سے کسی قد آور ادیبہ کی تصویر سے کرسی صدارت کو مزین کر دیں تو بہتر رہے گا۔

''میری سانس اور آواز ایک دوسرے کے لیے بوجھ ہیں، ہر طرف اور ہر طرح سے کمزور ونڈھال ہوں۔ دوائیوں نے وقت اجیرن کر دیا ہے............

''امید ہے آپ لوگ میری اس کوتاہی عذر داری سے درگزر یں گے۔

والسلام

طالب خیر

عالیہ اسما''

مگر اسی خط پہ ہم نے انگریزی کا ایک بہت بڑا No لکھا۔ اور نیچے یہ فقرے: ہمارا وعدہ ہے کہ آپ سے آدھ صفحہ سے زیادہ نہیں پڑھوائیں گے۔ اور وہ بھی آپ اپنے بارے میں نہیں کہیں گی، علامہ صاحب کے بارے میں کہیں گی۔ میں انہیں یہیں بلوچستان کے دانشوروں کے سامنے ایک بھرپھر

لانا چاہتا ہوں۔اور آپ کو بھی۔ یہ میرا ارمان ہے''۔

اور پھر ماں جیسی مہربان عالیہ اسما جسے ہم سب احترم سے ''کوکو'' کہتے ہیں، خود ہمارے لیب تشریف لائیں، یہ بتانے کہ وہ سیمینار کی صدارت کے لیے آجائیں گی۔ ساری زندگی درس و تدریس سے وابستہ ''کوکو'' اب ایک ریٹائرڈ ہیڈ مسٹریس ہے۔ اخلاقی موضوعات، صوفیوں، درویشوں کے سوانح اور انسانی فلاح کے موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے جو بہت بڑی تعداد میں ماہتاک **سنگت** میں چھپتے رہے۔ اس نے بالخصوص اپنے والد اور ہمارے خطے کے بہت ہی روشن خیال دانشور و عالم، علامہ عبدالعلی اخوندزادہ کے بارے میں بہت لکھا۔ اسے جلسوں اجلاسوں کی صدارت کے لیے بے شمار دعوت نامے موصول ہوتے ہیں مگر وہ اپنی افتادِ طبع، بزرگ سنی اور بیماریوں کے سبب معذرت کرتی ہے۔ البتہ سنگت اکیڈمی پہ اس کی مہربانی خصوصی تھی۔ اسے صدارت کے لیے راضی کرنے کی ''سازش'' میں علامہ عبدالعلی کے پڑپوتوں فیصل زمان، درمرجان اور مصلح الدین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ اللہ انہیں صحت اور زندگانی دے۔ اور علامہ جیسا بڑا پن عطا کردے۔

سنگت اکیڈمی کی بزنجو تقریبات ہر سال تین نشستوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ایک نشست سیمینار کی ہوتی ہے، دوسری نشست میں اُن نئی کتابوں پہ تبصرے ہوتے ہیں جو اس دوران شائع ہوتی ہیں۔ اور تیسرا سیشن بین السانی امن مشاعرے کا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بار بھی انہی تین نشستوں کا لیے کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ سیمینار کمیٹی کی سربراہی محترمہ زینت ثنا کی تھی، کتابوں پہ تبصرہ کے سیشن کا انچارج وحید زہیر چنا گیا اور مشاعرہ کمیٹی افضل مراد کے حوالے کی گئی۔ سلیمان کاکڑ نے دعوتی کارڈ چھپوانے سے لے کر ہال کی سجاوٹ تک اور ریفریشمنٹ سے لے کر ڈسپلن کی نگرانی تک کا سارا کام اپنی کمیٹی کے ذمے لے لیا۔ کراچی میں فاطمہ حسن تھی، فہمیدہ ریاض تھی اور عنادل راشدی تھی۔ ہدایات کی آمد و رفت تھی، مشورے، رضامندی، اختلاف، ٹیلیفون، ای میل، ایس ایم ایس، ٹی سی ایس سب کچھ چل رہا تھا۔ لاہور سے شبینہ رفعت اور افضل توصیف ہماری نگرانی فرما رہی تھی۔

سیمینار کا ایک حصہ مکمل طور پر رابعہ خضداری کے لیے وقف کر دیا گیا جس کی تدوین و شیڈول کے لیے ڈاکٹر علی کمیل قزلباش نے اپنی خدمات عطا کیں۔ اس سے قبل جناب فرمان فتح پوری سے اسلام آباد میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور جب میں نے اس سے ان تقریبات کا تذکرہ کیا تھا تو یہ

خوشگوار حیرت ہوئی کہ رابعہ خضداری پہ اس نے بھی بہت عرصہ قبل لکھا۔ رابعہ پر اس کا مضمون مارچ 1961 میں رسالہ ''نگار'' میں چھپا تھا۔ جبکہ ہمارا خیال ہمیشہ یہ رہا تھا کہ بزرگوں میں محترم ڈاکٹر انعام الحق کوثر وہ واحد سکالر ہے جس نے رابعہ خضداری پہ کام کیا ہے۔ اب یہ دو بزرگ اور بلاشبہ بڑے دانشور ہمیں میسر ہو گئے۔ جوانوں میں علی کمیل قزلباش مل گئے۔ علی بابا تاج نے بھی لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ سلطان قیصرانی ''بلوچی ادب اور خواتین'' کے عنوان پہ ایک پوری کتاب لکھ لایا۔ جسے اس نے مختصر کر کے مقالہ جتنا بنا ڈالا۔ پشتو میں لورالائی سے خیر محمد عارف سے درخواست کی تھی اور اس کا مقالہ ملنے یا نہ ملنے کی غیر یقینی صورتحال کے تحت خلیل باور اور فاروق سرور سے بھی مقالہ لکھنے کا کہا۔ اول الذکر نے اپنا مقالہ بھجوا دیا اور خود نہ آسکا جبکہ دونوں ثانی الذکر اپنے مقالے وقت سے بہت پہلے لا چکے تھے۔ ''براہوی لوک ادب اور خواتین'' پہ افضل مینگل سے زیادہ اچھا مقالہ کون لکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اسی سے درخواست کی۔ اور یہ درخواست ہم کرتے ہی رہے۔ مگر آخری دن تک مینگل صاحب مینگلی تکلف سے کام لیتا رہا، ''آج لکھوں گا، کل لکھوں گا''۔ اتنے بڑے پیمانے کے قومی سیمینار کی دیگر ذمہ داریاں ایک طرف، اور افضل مینگل کے مقابلے کی غیر یقینیت ایک طرف۔ لیکن:

میریں چاکرا گوئشتہ صبر مڑداں عجبے ناں

بیرم غوری سے مقالہ لکھوانا لوگوں کے لیے بہت مشکل ہوگا مگر ہمارے لیے بلوچی ضرب المثل کے بطور ''بغیر کانٹے کے درخت پر سے شہد کا چھتہ اتارنے'' کا کام تھا یعنی بہت آسان کام۔ اسے ''بلوچستان کے ادب میں صنفی مسائل'' کا عنوان دیا گیا جو اس نے نہ صرف وقت مقررہ سے بہت پہلے لکھ ڈالا بلکہ ٹیلیفون پر یہ معذرت بھی کر ڈالی کہ اس کا مقالہ سیمینار میں پڑھنے سے بہت دن قبل ''سہواً'' کسی اخبار میں شایع بھی ہو گیا۔ محترمہ سیمین نغمانہ نے ''بلوچستان میں خواتین کا ذہنی اور فکری سفر'' کے دیے گئے عنوان پہ بہت ہی خوبصورت مقالہ ہمارے حوالے کر دیا۔ زینت ثنا نے شہداد و مہناز کی بلوچی کلاسیکل داستان پہ پیپر لکھا۔ میں خود آج تک مست توکلی کے طواف سے نکل ہی نہیں پایا چنانچہ ان کے چھوٹے بھائی پیرک کی محترمہ گراں ناز سے عشقیہ داستاں پہ اپنا مقالہ تیار کیا۔ یہ سب کام سیمینار کے انعقاد سے ایک ماہ قبل سر انجام دینے تھے، دے دیے۔ یہ بہت ضروری ہوتا ہے ورنہ ہمارے دانشور جو علم و معلومات سے بھرے ہوئے ہیں مگر جنہیں اظہار کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ تو کبھی کبھار جب کوئی

سیمینار وغیرہ منعقد ہوتا ہے تو آدھ آدھ گھنٹہ کا مقالہ پڑھتے ہیں جس سے سارا انتظام اور اس کا سارا توازن برباد ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے ایک ڈیڑھ ماہ قبل دوستوں سے مقالے لکھنے کی درخواست کی۔ اس طرح سیمینار شروع ہونے سے پندرہ دن قبل سوائے ایک کے باقی سارے مقالے انتظامیہ کے پاس تھے۔ جنھیں کمپیوٹر پر کمپوز کرا کر مقالہ نگار کو کاپی نکال کر دی گئی۔ ہر دوست کے لیے انہی سے مشورہ کر کے ٹائم رکھا گیا۔ زیادہ سے زیادہ 12 منٹ کا۔

محترمہ طاہرہ احساس کی نظم ''بنت حوا'' پر ایک ٹیبلو پیش کرنے کا آئیڈیا فہمیدہ ریاض نے پیش کیا۔ میں نے چونکہ یہ نظم پڑھی نہ تھی اس لیے لیت و لعل سے کام لیتا رہا۔ دوسرے احباب نے بھی پڑھے بغیر اس نظم کی افادیت کو بہت کم جانا۔ ہمارے سنگت تھیٹر کے احباب نے بھی تکنیکی اعتبار سے اسے ناقابلِ عمل گردانا۔ مگر فہمیدہ ریاض نے ضد کی حد تک اسے شامل کرانے پر اصرار کیا۔ اور جب جھنجلاہٹ میں یہ نظم مجھے سنا ڈالی تو اندازہ ہوا کہ میں غلطی پر تھا اور نظم واقعی بہت ہی خوبصورت ہے۔ چنانچہ اس میں ملاّئیت کے چند مصرعے حذف کر کے اسے آدم اور حوا کے درمیان ڈائیلاگ بنا کر عابد میر اور نیلم مومل کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کی ریہرسل کریں۔

سنگت تھیٹر کا اے ڈی بلوچ بہت ہی اچھا پروڈیوسر ہے۔ مگر چونکہ بلوچ ہے اور ہم بلوچ دوسروں کو تسلیم کرنے کے بجائے خود ہی ڈیڑھ خان ہیں۔ اس لیے اس بڑے آرٹسٹ کی قدر بھی ہم نہ کر سکے۔ اے ڈی بلوچ کے ذمے سوویت افسانہ نگار محترمہ ویرا اِن بر کا افسانہ ''نور بی بی کا جرم'' تھما کر اسے ڈرامائی شکل میں پیش کرنے کا کہا۔ اس نے بڑے پیار سے ہمیں سہا۔ افسانہ پڑھا اور پڑھ کر عملاً اچھل پڑا۔ اچھل کر حاضرین کو پھلانگتا ہوا کمرے سے نکل گیا اور رات کو جب وہ واپس آیا تو اس افسانے کو ڈرامائی تشکیل دے چکا تھا۔ اے ڈی بہت پر جوش تھا۔ اس کے ہاتھ ایک بہت خوبصورت خیال لگا تھا۔ وہ اداکاروں کے انتخاب اور ریہرسل میں لگ گیا اور ہم اپنے باقی کاموں میں۔

ہماری ایک خواہش تھی کہ ہم کسی خوش گلو فن کار کے مترنم آواز میں رابعہ خضداری کے کلام سے سیمینار کا آغاز کریں۔ ڈاکٹر قزلباش نے اس کا ذمہ لیا۔ اور بہت تگ و دو کے باوجود آخری دن اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ ہماری دوسری خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ سیمینار میں درمیان میں فارسی کی کسی طالبہ سے رابعہ کا کلام تحت اللفظ سن سکیں۔

وقتِ مقررہ پر دعوت نامے بٹے، خبر اخباروں میں لگی، بینر تیار ہو کر آئے، ہال سجا، لائٹس اور ساؤنڈ سسٹم نصب ہوئے اور ہر طرح سے تیاریاں بالکل مکمل۔ کراچی سے مہمان آئے۔ اب کے ان میں دو بہت اچھے انسانوں کا اضافہ تھا۔ برصغیر کی مشہور گلوکارہ محترمہ گلشن آرا سید اور علم و دانش کے گھرانے کی چشم و چراغ محترمہ عنادل راشدی۔ یہ تھا چار کا ٹولہ جو کراچی سے تھا، لاہور سے کسی اور تقریب کے سلسلے میں بہت ہی محترم ہستی اور ماہتاک سنگت کے ایڈیٹوریل بورڈ کی سینئر ممبر محترمہ افضل توصیف آئی ہوئی تھی۔ جس کے ساتھ نظم کی بہت اچھی شاعرہ اور کوئٹہ ہی کی بیٹی محترمہ نسرین انجم بھٹی تھی۔ پھر ایک اور تقریب کے سلسلے میں عطیہ داؤد آئی ہوئی تھی۔ جس کے ساتھ اس کی میزبان، عصمت تھی۔ یوں ہمارا سیمینار ہر لحاظ سے ایک قومی سیمینار بن گیا۔ اور پھر ان لوگوں نے جب مقالے سنے تو بالکل حیران رہ گئیں کہ اس اعلیٰ معیار کے مقالے تو بہت کم سننے کو ملتے ہیں۔

چونکہ مہمان دو دن قبل پہنچ گئے تھے اس لیے ان کی مہمان نوازی میں ہاتھ بٹانے کے لیے اپنے اچھے دوست شمیم آفریدی کو تکلیف دی۔ ڈاکٹر ثنا اللہ گزوزئی تو ویسے ہی ہر دم موجود تھے۔ ایک پر تکلف عشائیہ شمیم آفریدی نے اپنے خوبصورت گھر میں دے دیا۔

واضح رہے کہ مقالے زیادہ ہو جانے اور ڈرامہ کے شامل ہو جانے کو دلیل کے بطور استعمال کر کے وحید زہیر کی کمیٹی نے کتابوں پر تبصرے کے سیشن کو گول کرنے کا فیصلہ کیا۔ بین السانی امن مشاعرے کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا تھا مگر اُسے موضوع بحث نہ بنا کر اسے بچا لیا گیا۔

چار ستمبر اتوار کا دن تھا۔ صبح ہی سے توجہ کے سارے مراکز ہال میں منتقل ہوئے۔ سنگت اکیڈمی اوستہ محمد نے اپنا بینر لگایا۔ مجلس اقبال نے بھی بینر کے ذریعے سیمینار کے موضوع کے ساتھ یک جہتی جتائی۔ سندھ ٹی وی نے پورے پروگرام کی کوریج کے انتظامات کر ڈالے۔ یوں شام ساڑھے چار بجے سے ہال کی رونقیں بڑھنے لگیں۔ اور محترمہ عنادل راشدی کے رجسٹریشن کا ڈیسک سجانے سے قبل ہی ہال آدھا بھر چکا تھا۔ سیمینار میں شرکت کرنے والی خواتین و حضرات نے وقت کی پابندی کرنے کی ہماری درخواست پر خوب عمل کیا اور پانچ بجے تک ہال کھچا کھچ بھر گیا۔

اس بار بولان میڈیکل کالج کے ایم بی بی ایس بالعموم اور بالخصوص بی ڈی ایس کے طلباہ و طالبات نے اچھی تعداد میں شرکت کی۔ بلوچستان یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات آئے۔ شاعر، صحافی،

دانشور تھے، ترقی پسند اور روشن خیال لوگ تھے۔ سیف الدین بوہرہ اور عبداللہ جان جمالدینی جیسے بزرگوں نے سیمینار کی قدر و قیمت بڑھائی۔ یہ ہر لحاظ سے اہل الرائے کا نمائندہ اجتماع تھا۔

ہاں البتہ، مجھے ڈاکٹر خدائیداد کی عدم موجودگی کاٹ کھاتی تھی۔

اس سیمینار کی کارروائی منتظمین کے مقرر کردہ وقت سے محض پندرہ منٹ لیٹ شروع ہوئی۔ اور بلوچستان کے سیمیناروں اور ادبی علمی تقریبات میں یہ نئی بات تھی۔ ورنہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو جانا تو کوئی بات ہی نہیں۔ اس سیمینار کی دوسری دلچسپ بات یہ تھی کہ اس میں ہمارا سارا روایتی طرز باقی نہ رہا۔ اسٹیج سیکرٹری کے لیے نوشین قمبرانی کا نام زیر تجویز تھا، وہ نہ آئی، مقررین کی اکثریت بھی روایتی لوگ نہ تھے۔ صدارت کرنے والی ہستی بالکل نئی تھی۔ ہال کے اندر متحرک احباب سب کے سب نوجوان اور نئے تھے۔ اس بار سعید کرد دکھائی نہ دینے والا متحرک ترین سپاہی تھا۔

سٹیج کے فرائض پر کراچی کی فاطمہ حسن نے مکمل طور پر اپنا قابو جمالیا۔ صدارت کی کرسی پر اس کے شایان شان ہستی محترمہ عالیہ اسما تشریف فرما ہوئی۔ مہمان خصوصی میر عبداللہ جان جمالدینی سٹیج پہ نہ آسکنے کی وجہ سے نیچے حاضرین کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس کی کرسی جائز طور پر محترمہ فہمیدہ ریاض کے حوالے ہوگئی۔ اس طرح پورے اسٹیج پہ خواتین ہی بیٹھی تھیں، کارروائی خاتون نے چلائی، اچھی خاصی تعداد خواتین کی تھی اور سیمینار کا عنوان بھی خواتین سے متعلق تھا۔ سٹیج سیکرٹری گویا ہوئی:

''معزز خواتین و حضرات!

''سنگت اکیڈمی آف سائنسز اور ویمن اینڈ ڈویلپمنٹ ایسوسی ایشن ''وعدہ'' کی جانب سے آپ سب کو خوش آمدید۔ یہ سیمینار بزنجو امن تقریبات کا حصہ ہے۔ علمی و ادبی سطح پر منعقد ہونے والی بزنجو ادبی وثقافتی تقریبات کو جہاں میر غوث بخش بزنجو کی فکر و فلسفے سے ہم آہنگ رکھا جاتا ہے وہاں سکالرز کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس کے حوالے سے کسی ایک موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کریں۔ بابا بزنجو خواتین کے حقوق کی ضمانت کو آئیڈیل بلوچ سماج کا اہم ستون گردانتا تھا۔ وہ زندگی بھر مظلوموں اور محکوموں کے حقوق کی جدوجہد میں مصروف رہا۔ استحصال و استبداد کے خلاف اس کے فکری و عملی اقدامات اور انقلابی قوتوں کی سربراہی و سرپرستی اُس کی شناخت رہی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عورتیں وہ طبقہ ہے جو سب سے زیادہ استحصال کا شکار رہا ہے۔ سنگت اکیڈمی آف سائنسز نے اس حقیقت کو پیش

نظر رکھتے ہوئے اس سال بلوچستان میں مختلف زبانوں کے ادب اور تاریخ میں خواتین کا حصہ بطور موضوع منتخب کیا ہے۔ آج کے سیمینار میں اسی موضوع پر ہم اہل علم و دانش کے مقالے سنیں گے۔ یہ بھی ایک خوشگوار اتفاق ہے کہ بابا بزنجو کا آبائی ضلع خضدار ہے اور آج کی تقریبات کا آغاز اسی مقام سے کیا جا رہا ہے۔ ابتدا کرتے ہیں بلوچستان کی تاریخ کی سنہری شخصیت اور ہماری بہت بڑی شاعرہ رابعہ خضداری کے کلام اور سوانح حیات سے، جن کے لیے سیمینار کا نصف حصہ خصوصی طور پر مختص ہے''۔

فاطمہ حسن نے ممتاز ادیبہ، شاعرہ اور دانشور محترمہ فہمیدہ ریاض کو سیمینار کا تعارف کرنے کے لیے اسٹیج پر بلایا۔ جس نے ''گوہر کی اونٹنیاں'' کے عنوان سے بلوچستان میں خواتین کے ادب کے حوالے سے اس سیمینار کو خود شناسی کی جانب ایک قدم کہا۔ بلوچستان کی خواتین نے جن نامساعد حالات میں علم و ادب کی شمعیں جلائیں فہمیدہ ریاض نے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ اس نے کہا کہ شاعر اور ادیب کوئی بھی زبان بولتا ہو اس کا دل محبت ہی کے لیے دھڑکتا ہے۔ یہی محبتیں اعلیٰ تہذیبوں کو جنم دیتی ہیں۔

بعد ازاں سیمینار اپنے پہلے حصے کی طرف آیا۔ ہزار سال قبل اس سرزمین پہ ایک شاعرہ نے جنم لیا تھا۔ فارسی کی وہ شاعرہ تاریخ کے باب میں اپنے شعری سرمائے کے ساتھ آج بھی تابندہ و زندہ ہے۔ اس کے کام اور شخصیت پر مقالے پڑھنے والے دوستوں میں سب سے پہلے ڈاکٹر علی کمیل قزلباش کو بلایا گیا جو فارسی، پشتو اور اردو کا سکالر ہے۔ حال ہی میں تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر چکا ہے۔ اس نے بہت ہی قیمتی بات کہہ دی کہ ادب میں کچھ نام ایسے ہی جن کے آثار و افکار کے حوالے سے معلومات و مواد کم ہونے کے باوجود کوئی بھی تحقیقی عمل ان کے ذکر کے بغیر آگے نہیں بڑھتا۔ ایسا ہی ایک نام زین العرب رابعہ خضداری کا ہے۔

رابعہ خضداری پہ ہی اگلے خطاب کے لیے علی بابا تاج کو دعوت دی گی جس نے بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے گولڈ میڈل حاصل کیا اور جو مقامی کالج میں فارسی کا محترم استاد ہے۔ علی بابا نے بی بی رابعہ خضداری کو ایک آفاقی شاعرہ قرار دیا۔

رابعہ خضداری پہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مقالہ موصول ہوا جسے وقت کی کمی کے پیش نظر پیش نہ کیا جا سکا مگر مقالہ کی آمد کی رسید اعلان کر کے دی گئی۔

رابعہ خضداری پر ہی اس سیمینار کا آخری مضمون بلوچستان کی علمی دنیا کی سینئر ترین شخصیت ' عالم و محقق ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب کا نام بلوچستان میں ادبی علمی تحقیق کے لحاظ سے بالعموم اور حضرت رابعہ خضداری کے فن و شخصیت پہ تحقیق سے متعلق بالخصوص احترام و اکرام والا نام ہے۔ بی بی رابعہ پر اس کے کئی مقالے شایع ہو چکے ہیں۔

سیمینار کے دوسرے حصے کا عنوان تھا ''بلوچستان کا ادب اور خواتین''۔ اس حصے کا آغا ز ایک ایسی خاتون کی تحریر سے کیا گیا جن کا قلمی نام اجالا مینگل ہے۔ دنیا کی نظروں سے دور یہ آج بھی ایک روایتی زندگی گزار رہی ہے۔ اس سیمینار میں شرکت کا راستہ بھی اس کے لیے بند تھا۔ لیکن اس کی فکر اور تحریر کو اس پلیٹ فارم سے اڑان مل گئی۔ اجالا مینگل کے مضمون کا عنوان تھا ''ایک بلوچ عورت جب قلم اٹھاتی ہے''۔ اسے فاطمہ حسن نے پڑھ کر سنایا۔ اس کی اس تحریر کو بھرپور پذیرائی ملی۔

پشتو اور اردو کے ممتاز افسانہ نگار، ٹی وی کے جانے پہچانے آرٹسٹ اور مشہور کالم نگار جناب فاروق سرور نے اپنا مقالہ ''پشتو لوک گیت اور خواتین'' کے موضوع پر پیش کیا۔

پشتو کے ایک اور ادیب و دانشور، کالج ٹیچر، ریڈیو اور ٹی وی کا معتبر نام خلیل باور نے اپنا مقا لہ ''انگئی۔ پشتون عورت کی فریاد'' کے عنوان کے تحت پیش کیا۔

''پشتو ادب میں خواتین کا حصہ'' کے عنوان سے لورالائی سے جناب خیر محمد عارف کا موصول شدہ مقالہ وقت کی کمی کے پیش نظر پڑھا نہیں جا سکا۔

اس کے بعد بلوچی اور اردو کے ممتاز سکالر، خصوصاً بچوں کے ادب پہ اپنے کام کی بنا پر مشہور ، اور عمر خیام کی رباعیات کے بلوچی ترجمے کے حوالے سے پہچانے جانے والا، جناب سلطان نعیم قیصر انی آیا اور ''بلوچی لوک ادب اور خواتین'' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

قدیم بلوچی شاعری کے خزینے جمع کرنے والے ہمارے ریسرچ سکالر، اور میر گل خان نصیر کی شاعری کے حافظ، جناب یوسف گچکی نے ممتاز بلوچی افسانہ نگار مرحومہ گوہر ملک کے فن اور شخصیت پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

زینت ثنا کو بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ بلوچی سے سترہ برس سے وابستگی ، بلوچی زبان و ادب میں پہلی ایم اے ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر کمپیئر اور

مختلف موضوعات پر مذاکروں میں حصہ لیتی رہی ہے۔ اس کے مقالے کا موضوع تھا ''بلوچ معاشرے میں نسوانی عظمت کی اولین جرّی آواز، مہناز''۔

پاکستان ٹی وی سے وابستہ، براہوی لوک ادب پہ دسترس رکھنے والے، اور براہوی کی تمام اصناف میں لکھنے والے محترم افضل مینگل کو ''براہوی لوک ادب اور خواتین'' کے موضوع پر مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ بہت ہی خوبصورت مقالہ تھا اس کا۔

اس کے بعد بلوچستان یونیورسٹی میں شعبہ ابلاغ عامہ سے وابستہ، اردو کا جانا پہچانا شاعر اور دانشور بیرم غوری ''بلوچستان کے ادب میں صنفی مسائل'' پر بولا۔

بلوچستان کی تاریخِ صحافت کی ماہر، شعبہ ابلاغ عامہ بلوچستان یونیورسٹی کی سربراہ ڈاکٹر سیمی نغمانہ طاہر کے مقالے کا عنوان تھا: بلوچستان میں خواتین کا ذہنی اور فکری سفر۔

لاہور سے تشریف لانے والی ممتاز ادیبہ محترمہ افضل توصیف نے بھی اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا۔ اس نے اس سیمینار کو ادب کے فروغ اور خواتین میں شعور و آگہی پھیلانے کا ضامن قرار دیا۔

تقریب کا آخری حصہ جو علمی ہونے کے ساتھ ساتھ پرفارمنگ بھی تھا، پر آنے سے قبل مہما ن خصوصی قابلِ احترام، ہردلعزیز میر عبداللہ جان جمالدینی کو دعوت خطاب دی گئی۔ جس نے محترمہ عالیہ اسما کے والد گرامی کی تعلیمات کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

نامور شاعرہ، ادیب و دانشور محترمہ طاہرہ احساس کی نظم ''بنتِ حوا'' کو عابد میر اور نیلم مومل نے مکالمہ کی صورت میں تحت الفظ پیش کیا۔ بہت مضبوط شاعری تھی، زوردار انداز میں پیش کی گئی اور بہت پسند کی گئی۔ خانزادی رحمٰن کرد نے اپنے والد ڈاکٹر سلیم کرد کی خواتین سے متعلق براہوی نظم کا انگلش میں ترجمہ پیش کیا۔ جس میں شاعر نے عورت کو ''مدر آف یونیورس'' کہا۔

بعد ازاں محمد مراد پارکو والا نے خوبصورت لوک نغمہ سنا کر محفل کو لالہ زار کر دیا۔ ہمارے غیر بلوچ مہمان بالخصوص، اس عوامی فنکار سے متاثر ہوئے۔ زبان نہ سمجھنے کے باوجود موسیقی کی بین الاقوامی بولی انہیں محظوظ کرتی جاتی تھی۔ سب سے بلند تالیاں انہی کی تھیں۔ انہوں نے ہمارے محمد مراد کو بہت سراہا اور ان کی کلوز اپ تصاویر لیں۔

ہال میں نامور گلوکارہ، موسیقی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ، ادب وشاعری کی قدردان محترمہ گلشن آرا سید موجود تھی جو اس پروگرام کے لیے خصوصی طور پر کراچی سے تشریف لائی تھی۔ اسے دعوت دی گئی۔ اس نے محترمہ فہمیدہ ریاض کی ایک مشہور نظم گا کر پیش کی۔ کیا آواز ہے، کیا تقدس ہے، کیا متانت ہے۔ جیسے قندہار کی جیل میں بیورغ بول رہا ہو، جیسے مستیں توکلی پہ سمو کی یادیں اژدھے کا زہر بن چکی ہوں، جیسے اپنے عوام کی نجات کی تمنا میں شاشان کا بزنجو بولتا ہو۔ اس بڑے آرٹسٹ کے ہر لفظ کی ادائیگی میں ناروا سماج کی ایک ایک بے انصافی مضمون بن جاتی ہے۔ وہ گاتی جاتی ہے، فرشتے آمین کہتے جاتے ہیں، آنکھیں نم ہوتی جاتی ہیں۔ ہتھیلیاں بجتی جاتی ہیں۔

نامور ادیبہ دانشور اور علامہ عبدالعلی اخوندزادہ کی صاجزادی عالیہ اسمانے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آج کے دور کو دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے بزرگوں کی جدوجہد رنگ لا رہی ہے اور ہمارے ادبا اور شعرا ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے علم اور شعور کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ جن سے علم وشعر کی روشنی پھیلتی جا رہی ہے۔

تقریب کا آخری آئٹم ایک خوبصورت ڈرامہ تھا جس کا بنیادی خیال ویران بر کے افسانے ''نور بی بی کا جرم'' سے لیا گیا۔ جس میں اس عورت کی منظر کشی کی گی تھی جو چھوٹی سی عمر میں خوبصورت خواب دیکھتی ہے۔ مگر اس کا مقدر اس خواب کے بالکل برعکس نکلتا ہے۔ اسے رونا ہی ہوتا ہے، اس نے سہنا ہی ہوتا ہے۔ ڈارمے کی تحریر وہدایات وپیشکش تھی؛ جناب اے ڈی بلوچ کی۔ اور اسے پیش کیا سنگت تھیٹر بلوچستان نے۔ ہمارے فن کاروں نے اس ڈارمہ کو اس خوبصورتی سے پیش کیا کہ حاضرین کی آنکھوں میں عملاً آنسو چھلک رہے تھے۔ عمر فاروق اس ڈرامے کا راوی تھا۔ اے ڈی بلوچ نے ماہین ثنا، غزالہ، جہانگیر کاکڑ، صبیحہ اور شازیہ جیسے عمدہ فنکار ڈھونڈ نکالے کہ اُسے گلے لگانے کو دل کرتا ہے۔ ہم نے لاہور اور کراچی کے محترم مہمانوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ یہ اس قدر بھرپور اور مکمل پیشکش تھی کہ اس ڈارمہ کو پورے ملک میں دکھایا جانا چاہیے۔ بلوچستان زندہ باد۔

ایک مختصر سا وقفہ دیا گیا اور اس کے بعد مشاعرہ منعقد ہوا۔ نظامت پر مامور شہزاد نیر مشاعرہ کو اپنی زبان کے بیلچے پہ رکھ کر کبھی اس ادارے کا بنا رہے تھے، کبھی اُس ادارے کا۔ ہم دل میں مسکراتے رہے کہ جہاں بلوچستان بلوچوں کا کہ پنجاب کا؟ کی بے فیصلگی میں 58 برس بیت گئے۔ اب آدھ گھنٹہ

بھی گزرنا تھا۔ ''میرا'' ''تیرا'' ویسے بھی بہت حقیر فلسفہ ہوتا ہے۔ بزنجو امن تقریبات والا مشاعرہ البتہ بین السانی ہوتا ہے۔ ''امن'' مشاعرہ ہوتا ہے۔ اور جم کے ہوتا ہے۔ اپنی شاعری پہ چوٹ کرتی افضل توصیف صدارت کر رہی تھی۔ پورے سیمینار کی تاحیات چیر پرسن فاطمہ حسن مہمان خصوصی تھی ....اسے دیکھ کر ہمیں اپنا امیر الدین یاد آتا ہے۔ میٹھی کھٹی نظموں کی مالکن نسرین انجم بھٹی کے لیے اعزازی مہمان کا لقب تعمیر کیا گیا۔ اس کی شاعری بہت اچھی تھی، اسے تو بلوچستان میں ہونا چاہیے تھا۔

ناطق سولنگی بابا بزنجو کو منظوم خراج عقیدت پیش کر رہا تھا جو اس دن کا مالک تھا، اس ہال کا مالک تھا اور ہال میں موجود دلوں دماغوں کا مالک تھا۔

شگفتہ شاہین ان لوگوں کے لیے اپنا دل جلانے اور مان جتانے پر کوس رہی تھی جو اپنی ذات کی قید سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ زیب النسا غرشین چاہے جانے والوں کو رسوانہ کرنے کی تلقین فرما رہی تھی۔ عظیم انجم ہانبھی اقدار، رواجوں کی طلب میں قدامت کی حمایت تک جانے سے خبردار کر رہا تھا۔ دانیال طریر پرستان میں سپاہی کو ڈھونڈ لایا، علی بابا تاج اس بار فارسی ماہیے کے بجائے اردو ہائیکو آزما رہا تھا۔ ڈاکٹر سلیم کرد جمہور کے پرچم تلے خون کے نذرانے دیتے ہوئے بہار منزل کی طرف رواں دواں قافلے کے سربہ کف چلتے رہنے کو سراہ رہا تھا۔ تسنیم صنم خواتین کے حقوق کے بارے میں شاعری کر رہی تھی۔ علی کمیل قزلباش نے ''ہمیں اس سے غرض کیا'' سنائی۔ افضل مراد خیمہ بستیوں میں کہرام کی وجہ تسمیہ پوچھ رہا تھا۔ خلیل باور نے پشتو میں اور عارف ضیا نے ''سبز رت'' کے نام سے اردو نظم پڑھی۔ بیرم غوری کی دُہائی تھی کہ ہم تو اپنے موسموں پہ گفتگو میں مگن رہے جبکہ دشمن نے کٹی فصل پہ شرارہ رکھ دیا۔ فاطمہ حسن محبوب کو مکمل طور پر جاننے کو ناممکن سمجھتے ہوئے محض اسے لمحہ بھر کے لیے سوچنے کو ہی غنیمت گردان رہی تھی۔ نسرین انجم بھٹی نے ایک اردو اور ایک پنجابی خوبصورت طویل نظم عطا کر دی۔ محترم افضل توصیف نے بھی پنجابی نظم پیش کی۔

سیمینار کے آخر میں مقالات پیش کرنے والوں کو شیلڈ پیش کی گئیں۔

رپورٹ: شا محمد مری

ماہنامہ سنگت، ستمبر 2005

سال2006

پہلی کابینہ

سنگت اکیڈمی آف سائنسز یوں تو ماہتاک **سنگت** کی اشاعت کے ساتھ ہی قائم ہوگئی تھی لیکن اس کی باضابطہ تنظیمی شکل 2006 میں عمل میں آئی۔ دسمبر 2005 میں پروگریسو رائیٹرز ایسوسی ایشن کے زیراہتمام سجاد ظہیر کی صدسالہ برسی کے موقع پر کراچی میں ہونے والی تقریبات میں شرکت کے بعد کچھ دوستوں کو اس تنظیم کو دوبارہ فعال کرنے کا خیال آیا۔ اس مختصر وفد میں شاہ محمد مری، سرور آغا اور وحید ظہیر کے علاوہ نوجوان عابد میر شامل تھے۔

کوئٹہ واپسی کے بعد مزید ہم خیال دوستوں کو جمع کیا گیا۔ اکیڈمی کو باضابطہ تنظیمی شکل دینے پر بحث ومباحثہ ہوا۔ دو سالہ کابینہ تشکیل پائی۔ سربراہی شاہ مری کو سونپی گئی۔ پھر اسی پلیٹ فارم سے سرگرمیاں ہونے لگیں۔ دیگر عہدیداروں میں وہی دوست تھے جو سابقہ پروگریسو رائٹرز ایسو سی ایشن یالوز چیذغ کے ہوتے تھے۔ عبداللہ جان جمالدینی، وحید زہیر، افضل مراد، سرور خان، جیئند جمالدینی۔

سال2007

اپریل:

15 اپریل 2007 میں پروگریسوز ایسوسی ایشن، پاکستان کی کانفرنس ملتان میں ہوئی۔ اس کی افتتاحی تقریر میں شاہ محمد مری نے شرکا سے اس تنظیم کی اہمیت اور اس کے لیے ضروری بھاری پن اور ذمہ داری کے بارے میں بات کی اور شرکا کو اس تنظیم کے آگے بڑھنے اور ترقی کی منازل طے کرنے کی راہ میں حائل رکاوٹوں سے خبردار کیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ:

''پاکستان میں ادبی صورتحال کچھ بہت اچھی نہیں ہے۔ ادب سے عوام کی دوری آج کی بہت ہی بدقسمتی حقیقت ہے۔ پھر ہمارے سماج میں بدی، بےانصافی اور انسان دشمنی والی غالب قوتوں کا ادب، فلم، مصوری اور شاعری میں بھی غلبہ ہے۔ ایسے میں روشن فکر ادیبوں کی انجمن ''پروگریسو رائٹرز

ایسوسی ایشن'' کو ایک بار پھر ملکی سطح پر منظم ومتحرک کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ایسی تنظیم جس کے اراکین لوگوں میں زندگانی سے محبت کرنے، زندگی کی سچی اور حیات بخش اقدار کو ترقی دینے، زندگی کو زیادہ آسودہ، آزاد اور باشعور بنانے کی صلاحیتیں ابھارنے کا کام کرتے ہیں۔ یہ بہت خوشی اور نیکی کی بات ہے۔ جمہوری، روشن فکر اور جینوئن تخلیق کاروں کا ایک ملک گیر تنظیم میں اکٹھا ہونا سماج کے متحرک اور انقلابی افراد، گروہوں، تنظیموں اور خود سماج کے لیے بہت اچھا ہے کہ نیچے سے اوپر، ادنیٰ سے اعلیٰ اور سادہ سے پیچیدہ کی طرف جدلیاتی ارتقائی سفر میں ایسی تنظیم بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ برداشت، ایثار، ہم آہنگی، خود تنقیدی اور اعلیٰ تہذیبی سطح کی دستیابی اور حصول کے امکانات افراد کو اور اس طرح معاشرے کو خوب نکھارتے سنوارتے ہیں۔ ایک صحت مند سماج کے قیام میں یہ باتیں بڑی اہم ہوتی ہیں۔

''اور یہ متفقہ پلیٹ فارم ایسا ہو جس پر انگلی نہ اٹھائی جا سکے۔ اس میں ایسی شخصیات، پردے کے پیچھے یا آگے نہ ہوں جو اپنی ذاتی نمائش اور پروجیکشن والا کام کریں۔ یہ تاثر نہ جائے کہ ہم کسی کے کہنے، سننے پر اکٹھے اور منظم ہوتے ہیں۔ ہمیں مسلط نہیں بلکہ اپنی اپنی سرزمین سے اگنا چاہیے۔ باید ہے کہ ہم اپنے عوام کی روایات کو مدنظر رکھ کر ارتقا کریں۔ تسلسل اور استقلال ہمارے ہر انضمام یا الائنس کے مغز ہونے چاہئیں۔ ملک میں موجود مختلف قوموں کی زبانوں اور کلچرز کے فرق کو کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جانا چاہیے۔ اپنی اپنی گل زمین کے ساتھ اپنے پیروں کی پیوستگی کو کسی صورت کمزور کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ شہری مراکز کی برق رفتار سوچ کے اطلاق کی غلطی نہیں کرنی چاہیے نہ ہی دیہات کی بھیڑ چال کے تسلط کی اجازت دینی چاہیے۔ نعرہ بازی بیکار کہ بڑی تبدیلیاں صرف عوامی جمہوری رجحان تلے ہی پروان چڑھتی ہیں۔ لاف زنی اور جذباتی ڈینگوں کی نفسیات کو اسی طرح دفن کرنا ہوگا جس طرح کہ معذرت خواہی اور خودترسی کی خصلتوں کو۔ مہم جوئی اتنا ہی نقصان دیتی ہے جس قدر کہ موقع پرستی۔ واضح رہے کہ ترقی پسند تحریک کبھی بھی Cheap تحریک نہیں رہی ہے۔

''پاکستان جیسے ماقبل جاگیردارانہ سماج میں انسان کے خونی رشتوں والی رشتہ داری سے بلند ہو کر تنظیم کاری ویسے ہی ایک نعمت ہوتی ہے اور وہ بھی صحت مند نقطہ نظر کے ترجمان ادیبوں، شاعروں، مصوروں، دانشوروں اور تخلیق کاروں کی تنظیم کاری۔ ایسی آرگنائزیشن گویا سماج کے انجن کی

آرگنائزیشن ہوتی ہے۔ ملک جس طرح کی فرقہ وارانہ انتہا پسندی کے گڑھے میں دھکیل دیا گیا ہے، جس طرح کی رجعتی سوسائٹی وقوع پذیر ہو چکی ہے اور جس طرح کی غیر جمہوری سوچ ہمارے عضو عضو میں کندہ کر دی گئی ہے...... ان تمام سے بڑے پیمانے پر نمٹنے کی ضرورت کو ایسی تنظیم پورا کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوگی۔ ایسی ہر پہل کاری کا گرمجوشی سے خیر مقدم کرنا چاہیے۔

''مگر یہ عزم اور کوشش جس قدر خوش آئند ہے، اسی قدر مشکل بھی ہے۔

''پاکستان میں ہر شعبے میں مسلط کردہ ٹرائبلائزیشن کے اثرات خود اس تنظیم پر کیا پڑیں گے؟ اس تنظیم میں پاکستان کی بے شمار قومی زبانوں کے باہمی جمہوری تعلقات کا اظہار اور نمائندگی کس طرح ہوگی؟ صوبائی دوریوں میں وہاں کے ادیبوں کی نزدیکی کو کس طرح ممکن بنایا جا سکے گا؟ سامراج اور حکومت کی ''تنظیم توڑ'' خصوصیات کا کیسے سامنا کیا جائے گا؟ رجعتی خیالات کی گہرائی اور گیرائی کے ادراک میں کیسی بصیرت دکھائی جا سکے گی؟ ملک میں علاقائی، صوبائی یا کہیں کہیں ملک گیر سطح پر پہلے سے موجود ترقی پسند ادبی تنظیموں سے کس طرح کے روابط رکھے جائیں گے......؟ یہ اور اس طرح کے بے شمار عملی مسائل ہیں جن سے نمٹنا ہوگا۔

''بہت احتیاط سے دیکھنا ہوگا کہ کیا ان گھمبیر مسائل سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیتیں موجود بھی ہیں؟ ایک بہت ہی مثبت سوچ کو عملی بنانے کے لیے ثابت قدمی چاہیے، شخصیت پرستی کی تدفین چاہیے، اور تنظیمی مہارت چاہیے۔ دیکھنا ہوگا کہ کہیں پہلے سے بے بس، اور مایوس عوام کو ایک نئی سبز امید دلاتے دلاتے اسے مزید مایوسی میں دھکیلنے کا جرم تو سرزد نہیں ہو رہا؟''

ملتان کانفرنس دو دن تک چلی۔ خوب بحث مباحثہ ہوا۔ رسمی غیر رسمی اجلاس ہوئے اور بالآخر پروگریسو رائٹرز کے از سرِ نو احیا کا فیصلہ ہوا۔ سنگت اکیڈمی آف سائنسز اپنا نام، شناخت اور تنظیمی ڈھانچہ برقرار رکھتے ہوئے وفاقی طور پر پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن سے ملحق ہوگئی۔ ملتان کانفرنس میں سنگت اکیڈمی کا سرپرستِ اعلیٰ میر عبداللہ جان جمالدینی PWA کا وفاقی نائب صدر منتخب ہوا اور اکیڈمی کا صدر شاہ محمد مری PWA بلوچستان کا سیکرٹری۔

جون:

3 جون 2007 کو اسلام آباد ہوٹل کوئٹہ میں منعقدہ اجلاس میں سنگت اکیڈمی آف سائنسز

نے اپنے صدر شاہ محمد مری سے پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی منعقدہ مرکزی کمیٹی کی میٹنگ کی کارروائی اور فیصلوں کے بارے میں رپورٹ سنی۔ PWA کی مرکزی کمیٹی نے وفاقی کابینہ کی مدت دو سال قرار دی۔ نیز مرکزی کمیٹی نے ہر صوبے سے دو دو ممبر لینے کا جو فیصلہ کیا تھا۔ سنگت اکیڈمی کی اس میٹنگ میں اپنی ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر ڈاکٹر سلیم کرد اور ڈاکٹر علی کمیل قزلباش کو منتخب کیا۔

جولائی:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی ماہانہ فکری نشستوں کے سلسلہ کی پہلی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت اکیڈمی کے سینئر ممبر پروفیسر برکت علی نے کی۔ عابد میر نے کہانی، وحید زہیر نے انشائیہ اور افضل مراد نے نظم پیش کی۔

نشست کا آغاز ڈاکٹر شاہ محمد مری کی طرف سے اس سوال کے ساتھ ہوا کہ اداروں کے ساتھ افراد کی نظریاتی کمٹ منٹ کیوں معدوم ہوتی جارہی ہے؟۔ اس پر بات کرتے ہوئے افضل مراد نے کہا کہ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ماضی میں نظریاتی انسپائریشن کا باعث لیڈرشپ اور اس کا عمل ہوتا تھا لیکن گذشتہ دَہائی سے لیڈرشپ جس طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی ہے اس کے اثرات سماجی زندگی، ادب اور عزائم پر بھی پڑے ہیں۔ معاشی مسائل نے بھی کمٹمنٹ کو متاثر کیا ہے۔ اب معاشرتی تضادات بڑھ گئے ہیں اور ہم نے ان تضادات میں جینا سیکھ لیا ہے۔ قلم، ضمیر اور فن بکنا شروع ہو گئے ہیں۔ ادب میں بھی اب کلاس پیدا ہو گئی ہے۔

جیئند خان جمالدینی نے کہا کہ اس میں ان مقتدر حلقوں کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے نظریات کی توڑ پھوڑ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر مری نے کہا کہ سوال یہ ہے کہ ان نشستوں کے ذریعے ہم کون سی کمٹمنٹ دے رہے ہیں جو ہمارے ممبران کو یہاں آنے پر مجبور کرے؟۔ اس پر وحید زہیر نے کہا کہ اگر ہم یہاں اچھی، نئی اور تخلیقی گفتگو کا ماحول پیدا کریں گے تو لوگ ضرور آئیں گے۔ اس کا مقصد بہت واضح ہے کہ اس سے ادب کی ترویج ہوتی ہے۔ مباحث کے ذریعے فکر کی نئی راہیں کھلتی ہیں، نئے لوگوں کی تربیت ہوتی ہے۔

اس کے بعد عابد میر نے ''داغ'' کے عنوان سے کہانی پیش کی جس پر تنقیدی گفتگو ہوئی۔

افضل مراد نے اپنی نظم ''ماں جب تک زندہ تھی'' پیش کی اس پر بھی تفصیلی گفتگو ہوئی۔

اسی سال سنگت اکیڈمی کے ڈاکٹر شاہ محمد مری کی **مستیں توکلی** نامی کتاب شائع ہوئی۔

ستمبر:

ستمبر 2007 میں منعقدہ مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں ملک کے اندر نافذ کی گئی ایمرجنسی اور اس کے تحت آزادیِ اظہار پر لگائی گئی ہر قسم کی پابندیوں کی مذمت کی گئی۔ اس سلسلے میں گرفتار کیے گئے دانشوروں، ادیبوں، صحافیوں اور انسانی حقوق کے کارکنوں کی آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔

اس کے علاوہ بلوچستان میں انسانی، اخلاقی، آئینی اور قانونی سطح پر حقوق کی جو پامالی جاری ہے، اس کی مذمت کی گئی۔

نومبر:

9 نومبر کو شام 4 بجے سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے مرکزی دفتر واقع مری لیب فاطمہ جناح روڈ کوئٹہ میں ادبی نشست کا انعقاد ہوا۔ جس میں طے شدہ پروگرام کے تحت جناب گل بنگلزئی نے افسانہ اور جناب سعید گوہر نے اپنا کلام پیش کیا۔ نشست میں سنگت اکیڈمی کے ممبران کے علاوہ دیگر اہلِ علم حضرات و نوجوانوں نے بھی شرکت کی۔ شرکا میں سنگت اکیڈمی کے عہدیداروں میں سے ڈاکٹر شاہ محمد مری، ڈاکٹر عنبرین مینگل، وحید زہیر، افضل مراد، ڈاکٹر علی کمیل قزلباش، ڈاکٹر سعید مستوئی، جنید خان جمالدینی، سعید کُرد کے علاوہ جناب غوث بخش صابر، جناب یوسف گچکی، دانیال طریر، عظیم انجم ہانبھی، فیصل احمد گوندل، عابد میر، سکندر یار سید، خان جمالی، غلام رسول آزاد و دیگر شامل تھے۔

نشست کا آغاز گل بنگلزئی کے افسانے سے ہوا۔ اس نے اپنا براہوی افسانہ ''در داتا گواچی'' پڑھ کر سنایا جس کا مرکزی خیال جاگیردارانہ سماج کے رویوں کے گرد گھومتا تھا۔ جس میں ایک جاگیردار اپنے بزگر کے بچوں کو پڑھنے نہیں دیتا اور اُسے بتاتا ہے کہ پڑھائی کے بعد لڑکے نافرمان ہو جاتے ہیں اور کام کاج نہیں کرتے حالانکہ اس کا اپنا بیٹا شہر میں پڑھ رہا ہوتا ہے۔

اس کے بعد جناب سعید گوہر نے اپنا کلام پیش کیا۔ حاضرین نے دل کھول کر داد دی۔

نشست کے اختتام پر جناب انجم قزلباش اور جناب بدرالحسن کی وفات پر تعزیت کی گئی۔

سال 2008

جنوری:

محترمہ نوشین قمبرانی ایک نئے شاعر کو دریافت کر کے لائی اور ٹیلیفون پر اُسے سنگت اکیڈمی کے دوستوں کی محفل میں خاص مہمان بنانے کا حکم دے گئی۔ بلوچی اور اردو کے اس نوجوان شاعر کا نام عمران ثاقب ہے۔

نوشین اور افشین ٹیلیفون کریں اور ہمیں اپنے مرحوم دوست نادر قمبرانی کی خوشبو نہ آئے، بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہونہار باپ کی ہونہار اولاد!!

موبائل ٹیلیفونوں کی لہریں دوستوں کو شہر کے کونوں کھدروں سے کھینچ لائیں۔ یوں کراچی کے اس بلوچ نوجوان شاعر کے اعزاز میں سنگت اکیڈمی کی جانب سے ایک نشست اکٹھی ہو گئی۔ ہمارے کم کم لکھنے والے مگر اچھے بلوچی شاعر جناب ساجد نبی بزدار نے صدارت کی۔ نوشین قمبرانی نے عمران اور اُن کی شاعری کا مفصل تعارف کرایا۔ اور محفل اُس کے حوالے کر دی۔

اچھا بھلا صحت مند، گورا چٹا نوجوان ہے اور '' آئیے گا جائیے گا'' والی اردو بولتا ہے۔ (یہ تینوں باتیں کسی بلوچ میں، بالخصوص مکران کے ایک بلوچ میں شاذ و نادر ہی یکجا ہوتی ہیں)۔ عمران ثاقب نے بے شمار شاعری سنائی۔ کچھ تحت اللفظ اور کچھ گا کر۔ کافر آواز ہے اُس کی۔ شاعری میں رنگ اور گہرائی دونوں موجود ہیں۔ اتنی داد تو اس نے لیاری میں بھی نہ لی ہوگی۔ اس نے اتنی اچھی محفل جمائی کہ اوروں کو بھی ترغیب ہوئی اور ہمارے کوئٹہ کے دوستوں میں سے افضل مراد، نوید حیدر ہاشمی، سیف بادینی اور نوشین قمبرانی نے بھی اپنا اپنا کلام سنایا۔ ایسے ہی، بیٹھے بٹھائے جنگل میں منگل منانے کی نعمت ہاتھ آئی۔ کتنا اچھا ہوتا ہے انسانوں کا اکٹھ!! کتنا اچھا ہوتا ہے بلوچوں کا اکٹھ!!

مارچ:

سنگت اکیڈمی کے دوسرے انتخابات

سولہ مارچ 2008 کو سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے نئے الیکشن ہوئے۔ اگلے دو برس کے لیے سرور خان نیا صدر منتخب ہوگیا۔ سلیمان کاکڑ کی جگہ وحید زہیر کو جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ عظیم انجم ہانبھی ڈپٹی جنرل سیکرٹری منتخب ہوا۔ ڈاکٹر منیر رئیسانی سینئر نائب صدر اور ڈاکٹر عنبرین مینگل نائب صدر

دوم جبکہ افضل مراد، ڈاکٹر شاہ محمد مری، جیئند خان جمالدینی،سعید کرد اور علی کمیل قزلباش ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔

جون:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کا جون کا ماہانہ اجلاس اکیڈمی کے سینئر نائب صدر ڈاکٹر منیر رئیسانی کی زیرِصدارت منعقد ہوا۔ بحث یہ چھڑی کہ ادبی علمی نشست کو کوئی ایسا نام دیا جائے جس سے ظاہر ہو کہ یہ بلوچستان کے فکری کارکنوں کی کوئی بیٹھک ہے۔اس میں سیاست، ثقافت اور صحت تمام مسائل کو زیرِ بحث لانا چاہیے۔

فیصلہ کیا گیا کہ فکری نشستوں کو قومی زبان بلوچی میں نام دینے پہ ابھی کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔اور اسے آئندہ اجلاس میں پیش کیا جائے تاکہ مزید دوستوں کے ساتھ مشاورت ہو اور اس کے بعد کسی حتمی نتیجے پر پہنچا جائے۔

ملکی سیاسی صورت حال کے تناظر میں اشتہاراتی کمپنیوں اور نیوز چینلز کی جانب سے معروف شعرا کے کلام کے سطحی وغلط استعمال اور گھٹیا پیروڈی کی شدید مذمت کی گئی۔اور اس سلسلے میں دو قراردادیں پاس کی گئیں۔

جولائی:

(1)

پشاور سے آئے ہوئے سکالرز ڈاکٹر سہیل انشا اور پروفیسر حنیف خلیل کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔بلوچستان یونیورسٹی کا لیکچرار جاوید اقبال بھی اس موقع پر موجود تھا۔سنگت اکیڈمی کے عہدیدار وممبران کے علاوہ ترقی پسند فکر سے وابستہ افراد اور طلبہ نے بھی اس نشست میں شرکت کی۔

سنگت اکیڈمی کے صدر محمد سرور خان نے مہمانوں سے اکیڈمی کے ممبران کا تعارف کروایا اور اکیڈمی کی سرگرمیوں سے متعلق مختصراً بتایا۔علی کمیل قزلباش نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔

ڈاکٹر سہیل انشا نے تفصیلی طور پر بتایا کہ بنیادی طور پر میں ترقی پسند سوچ کا حامی ہوں۔اس لیے میری خواہش تھی کہ میری کتاب میں ایسے مقالات ہوں جس سے سیاست اور ادب اکٹھے

ہو جائیں۔اس کے علاوہ ایک باب پورا بلوچستان کے ادب کے حوالے سے ہے،اس میں مجھ سے کوتاہی یا کمی بیشی ہو سکتی ہے کیونکہ میں بلوچی، براہوی پڑھ نہیں سکتا۔ مجھے خوشی ہے کہ ایک مختلف کام میں نے کیا ہے۔آج تک ان تینوں زبانوں کے ادب کا ایک ساتھ ادبی جائزہ کسی نے نہیں لیا۔

پروفیسر حنیف خلیل نے پشتو ادب کی مجموعی صورتحال پر مختصراً بات چیت کرتے ہوئے بتایا کہ پشتو کے قدیم ادب میں ''پٹہ خزانہ'' کو اولین نقش کی حیثیت حاصل ہے۔یہ 900ھ سے 1000ھ کے درمیان کا دور ہے۔اس زمانے میں بڑی بڑی زبانوں میں تحریریں موجود نہ تھیں مگر اس دور میں بھی ہمیں پشتو کے ادیب پیر روشان کی کتاب ملتی ہے۔اس کے بعد پھر خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کا زمانہ ہے۔خوشحال خٹک پر تو حیرت ہوتی ہے کہ اس نے ایک عمر میں کیا کیا کام کیے؟؛ جنگیں لڑیں،99 بچے پیدا کیے۔340 کتابیں تخلیق کیں جن میں سے اب تک بیس' پچیس دریافت ہو سکی ہیں۔شکار کا شوقین، ماہرِ طب، فلاسفر، شاعر، ماہرِ نفسیات......وہ کیا کیا نہ تھا۔اس کے بعد بیچ میں صرف فوک دور ہے۔بیسویں صدی میں البتہ پشتو ادب نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔امیر حمزہ شنواری اس عہد کا بڑا شاعر ہے۔40 کتابیں اس نے تخلیق کیں اور سب کی سب اعلیٰ معیار کی حامل۔

پشتو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کے حوالے سے پوچھے گئے سوال کے جواب اس نے کہا کہ اصل میں پشتون معاشرے میں ترقی پسند عناصر بنیادی طور پر موجود ہیں۔رحمان بابا بھی مزدور کی اور انصاف کی بات کرتا ہے۔تحریک تو بعد میں 1935ء میں لکھنو اعلامیے کے بعد شروع ہوئی،تب بھی ہمارے کئی لکھنے والے اس سے براہ راست وابستہ تھے۔کاکاجی صنوبر کا تذکرہ سجاد ظہیر نے اپنی معروف کتاب ''روشنائی'' میں خود کیا ہے کہ وہ بین الاقوامی سطح کا ادیب تھا۔اس کے علاوہ فارغ بخاری، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی اور اجمل خٹک اہم لوگ تھے۔قلندر مومند،سلیم راز اب بھی موجود ہیں۔

ایک دلچسپ بات اس نے یہ بتائی کہ 1903 میں بالشویک پارٹی بنی اور سوویت انقلاب 1917 میں آیا جبکہ ہمارے ہاں ایک شخصیت اسلم خان کمال نے 1913 میں اپنے ایک شعر میں براہ راست بالشویک اور لینن کا نام استعمال کیا ہے۔اس کے پشتو شعر کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ:

''کاش میرے سر میں لینن جیسا دماغ ہوتا اور میں بالشویکوں جیسی زندگی گزارتا تو اس

(مزدور) طبقے کی زندگی بدل دیتا''۔

پشتو ادب میں خواتین کے حصے سے متعلق ڈاکٹر سہیل انشا نے بتایا کہ اس وقت سو سے زائد شاعرات اور خواتین لکھاری نہایت تندہی اور جانفشانی سے اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔

(2)

6 جولائی سنگت اکیڈمی کا جنرل باڈی اجلاس اکیڈمی کے صدر محمد سرور خان کی زیر صدارت منعقد ہوا۔

سنگت کی فکری نشست کو ایک اچھا سا بلوچی نام دینے کا معاملہ کافی دیر سے زیرِ بحث تھا۔ بالآخر اِس جنرل باڈی اجلاس میں سنگت کی فکری نشستوں کے لیے عنوان ''سنگت پوہ زانت'' (سنگت شعور و دانش) طے ہوا۔ اب یہ نشستیں اسی نام سے منعقد ہوا کریں گی۔

(3)

سنگت پوہ زانت کا مہمانِ خصوصی بلوچی اور اردو کا نامور اور صاحبِ اسلوب افسانہ نگار پروفیسر غنی پرواز تھا۔ جبکہ ڈاکٹر علی کمیل قزلباش نے خصوصی مقالہ پیش کیا۔

سنگت اکیڈمی کے سیکرٹری جنرل وحید زہیر نے جناب غنی پرواز کا سنگت پوہ وزانت میں آمد پر شکریہ ادا کیا۔ اکیڈمی کا تعارف کرایا۔

پروفیسر غنی پرواز نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا بنیادی موضوع ہے ''افسانہ اور اس کی تکنیکیں''۔ اس کی بنیادی خصوصیات میں عنوان، تمہید، موضوع، مرکزی خیال، پلاٹ، کردار، بیانات، مکالمات، منظر نگاری، حلیہ نگاری، باطن نگاری، معاشرے کی عکاسی، حرکات و سکنات، وحدت تاثر، کلائمکس اور اختتام وغیرہ شامل ہیں۔

پلاٹ اصل میں واقعات، کردار، بیانات اور مکالمات کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ افسانے کے ڈھانچے کو پلاٹ کہتے ہیں۔ پلاٹ کی چار قسمیں ہیں۔ سادہ، مخلوط، منظّم اور غیر منظّم۔

افسانے کی تکنیکیں بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے تین سب پر حاوی ہیں اور بہت مشہور ہیں۔ علامتی تکنیک، وجودی تکنیک اور ترقی پسند تکنیک۔ جدیدیت کوئی ایک تکنیک نہیں بلکہ پانچ تکنیکوں کا مجموعہ ہے۔ مابعد جدیدیت کا بانی ژاک دریدا ہے۔ ترقی پسند تکنیک کہانی پر بہت زور دیتی ہے۔ اس

میں کہانی ہی کہانی ہوتی ہے۔ ہر چیز واضح ہوتی ہے۔ جبکہ جدیدیت نے کہانی پن کو ختم کر دیا کہ کہانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور مابعد جدیدیت کی بڑی خصوصیت کہانی کی واپسی ہے۔ وہ کہانی جو ترقی پسندوں نے افسانے کے اندر ڈال دی تھی اور جدیدیت نے اسے ہلاک کر ڈالا تھا، مابعد جدیدیت والے اسے واپس لے آئے۔

ترقی پسندوں کا ایک نظریہ ہوتا ہے۔ جدیدیت نے نظریے کی نفی کر دی کہ نظریہ کا وجود ہی غلط ہے۔ جبکہ مابعد جدیدیت نے کہا کہ نظریہ درست ہے مگر نظریہ کوئی بھی ہو سکتا ہے، اسے مخصوص نہیں ہونا چاہیے۔

ترقی پسندوں نے تحریر میں سادگی پر زور دیا تا کہ سب لوگ پڑھ اور سمجھ سکیں۔ ترقی پسند بہت زیادہ طویل وضاحتیں کرتے تھے۔ تمہیدیں ہوتی تھیں۔ مقصد ہر چیز کو واضح کرنا تھا۔ جدیدیت والوں نے کہا کہ ہر چیز غیر واضح ہونی چاہیے۔ اتنی غیر واضح کہ کوئی بھی نہ سمجھ سکے۔ مابعد جدیدیت نے کہا کہ وضاحت اچھی ہے مگر مختصر ہو۔

(4)

جولائی 2008 کو سنگت اکیڈمی آف سائنسز کوئٹہ کے زیر اہتمام پشاور کے ترقی پسند ادیب، سلیم رازؔ کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔

تقریب کے آغاز میں سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے جنرل سیکریٹری وحید زہیر نے سلیم راز سے شرکائے محفل اور اکیڈمی آف سائنسز کا مختصر تعارف کرایا۔

سلیم راز صاحب نے آغاز میں ہی تمام دوستوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنی تفصیلی گفتگو شروع کی۔

اس نے کہا کہ 1935ء میں تاریخ نے جو ذمہ داری ادیبوں پر ڈالی تھی آج معاشرے کو اس سے کہیں زیادہ روشن فکر ادیبوں کی ضرورت ہے۔ اب چونکہ ملٹی نیشنلز ہیں، لہذا اسامراج کی صورتیں بدل گئی ہیں، اب چونکہ کارپوریشنیں ہیں اس لیے قومی سرمایہ داروں کا تصور بدل چکا ہے۔ اب گلوبلائزیشن نے ایک اور طرح کے انٹرنیشنلزم کی زیادہ ضرورت بڑھا دی ہے۔ اب ان تمام حالات کو سامنے رکھ کر بات کرنی ہوگی۔ لیکن ہم چونکہ ایک خاص جغرافیائی حدود میں رہتے ہیں اس لیے ہم پر کچھ خصوصی

ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہاں سیاسی پارٹیاں موروثی پارٹیاں ہیں۔ ملک میں جو صورتحال بنی ہے وہ بہت بری ہے۔ لوگ جینے کے قابل نہیں رہے، عوام کی توجہ بنیادی مسائل سے ہٹانے کے لیے فروعی جھگڑے پیدا کیے جارہے ہیں۔ بائیں بازو کی کوئی مضبوط جماعت موجود نہیں جو اس صورتحال سے نمٹنے کو سامنے آئے۔ اس کمی کی وجہ سے یہ سیلاب انقلاب کی بجائے جرائم و انارکی کی تباہی لائے گا۔ یہ تاریخ کا جبر ہے اور وقت نے یہ ذمہ داری پھر ادیبوں پر عائد کردی ہے کہ وہ عوام کی رہنمائی کریں۔

سلیم رازؔ نے مزید کہا کہ دنیا بھر میں جب بھی کہیں بحران آتے ہیں تو عوامی رہنما ادیبوں، دانشوروں کے پاس رہنمائی کے لیے جاتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں عوامی دکھ درد رکھنے والے سیاست دان موجود ہی نہیں ہیں۔ یہ تو سرمایہ لگاتے ہیں اور اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ اس لیے اب ادیبوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی تحریریوں کے ذریعے عوام کی رہنمائی کریں۔ ایک طبقاتی معاشرے میں جمہوریت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک مخصوص طبقہ ہی پارلیمنٹ میں جاتا ہے۔ ایسے حالات میں ادیبوں کو اپنی جانبداری واضح کرنی چاہیے۔ غیر جانبداری منافقت ہے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ آپ ظلم کے ساتھ ہیں یا مظلوم کے ساتھ۔ جنگ میں غیر جانبداری کا مطلب، ظلم کا ساتھ دینا ہے۔

سلیم راز نے کہا کہ اگر آپ کراچی میں بیٹھ کر ترقی پسند کا جائزہ لیں گے تو وہ مختلف ہوگی اور بلوچستان میں صورتحال مختلف ہوگی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ادیب اپنے ماحول میں کتنا ترقی پسند ہے۔

اگست :

(1)

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی جنرل باڈی کا ماہانہ اجلاس برائے اگست 2008 تین اگست کو اکیڈمی کے صدر محمد سرور خان کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔

گزشتہ اجلاس کی کاروائی رپورٹ پریس سیکرٹری عابد میر نے پڑھ کر سنائی، جسے متفقہ طور پر منظور کرلیا گیا۔

سالانہ چندہ اور آمدن واخراجات کی رپورٹ، مالیات سیکرٹری کامریڈ کلیم نے پیش کی۔

طے ہوا کہ معروف بلوچ دانشور حکیم بلوچ کو سنگت پوہ وزانت کے سلسلہ میں لیکچر دینے کے لیے

بلایا جانا چاہیے تاکہ وہ عطا شاد کی شخصیت اور فن کے حوالے سے گفتگو کرے اور پھر اس پر سوال جواب کا سلسلہ ہو۔

اجلاس میں معروف شاعر احمد فراز کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی گئی۔ جبکہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) کے بزرگ رہنما کامریڈ ہرکشن سرجیت کے انتقال پر اظہارِ تعزیت کیا گیا۔

(2)

17 اگست 2008 کو سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے علمی وفکری نشستوں کے سلسلہ **پوہ وزانت** میں معروف دانشور حکیم بلوچ نے عطا شاد کی شخصیت اور فن کے حوالے سے خصوصی گفتگو کی۔

حکیم بلوچ نے گفتگو کا آغاز انسانی زندگی میں نظریے کے عمل دخل سے کیا۔ اس نے کہا کہ انسان نظریے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ قدیم عہد کے سے لے کر آج تک نظریہ اُس سے جڑا چلا آرہا ہے۔ قدیم انسان کے گلے میں جو مالائیں نظر آتی ہیں، وہ فیشن کے طور پر نہیں بلکہ عقیدے کے طور پر ہوتی تھیں۔ عقیدہ ایک قسم کا نظریہ ہی ہے۔ ہر ذی شعور کے ہاں کوئی نہ کوئی خیال ہوتا ہے۔ سماج میں مختلف خیالات کے حامل لوگ پائے جاتے ہیں۔ اور ہر عہد کے اچھے ادیب کو اور ادب کو اُس سماج کے انسانوں کے خیالات کو اجتماعی آواز دینی ہوتی ہے۔ ایسے ہی ادب اور ادیب کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ادب اپنے عہد کا ترجمان ہے۔............عطا شاد ایسے ہی ادیبوں میں سے تھا۔

عطا کی والدہ چونکہ پنجگور کی تھی اس لیے والد کی وفات کے بعد وہ تربت سے وہاں آگیا تھا ۔اس وقت وہ آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ 1956 میں سکول سے میٹرک کرنے والا اس کا پہلا بیچ تھا جبکہ 1957 میں ہمارا دوسرا بیچ تھا میٹرک کا۔ اس دوران وہاں ہم نے ایک ادبی سرکل بنایا۔ اس میں عطا بھی تھا، میں بھی تھا، ڈاکٹر نعمت اور صدیق آزاد بھی تھے۔ عطا شاد اس زمانے میں اردو میں شاعری کرتا تھا۔ اُس وقت بلوچی لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ جب ہم آئے تو کوئٹہ میں ریڈیو پاکستان قائم ہو چکا تھا۔ ایوب حکمران تھا۔ ان دنوں طلبہ یونین پر البتہ پابندی نہیں تھی۔ پروگرام ہوتے تھے، سٹڈی سرکل چلتے تھے۔ ہم دوستوں نے بھی مل کر ''لبز انکی دیوان'' کے نام سے ایک ادبی سرکل شروع کیا۔ جہاں لوگ اپنا کلام پڑھتے تھے۔ باہر سے بھی لوگ کلام بھجواتے تھے۔ ان دنوں اتنی پابندیاں نہیں ہوتی

تھیں ۔اس دوران اسمبلیاں بحال ہوئیں ۔ ہمارے ہی لوگ اسمبلی میں چلے گئے اور بلوچستان کے مسائل بیان ہونے لگے ۔اس کے باعث ہماری تربیت سیاسی بنیادوں پر ہونے لگی ۔لیکن عطا اس تربیت اور کمٹ منٹ سے محروم تھا۔وہ تب تک شاعر کے طور پر پختہ ضرور ہو چکا تھا۔لیکن سیاسی تربیت کا فقدان تھا۔شاعر تو حساس ہوتا ہے اور اپنے عہد کے مسائل کو محسوس کر کے پیش کرتا ہے ۔یہی عطا نے کیا۔اس حوالے سے اس نے بہت اچھی نظمیں کہیں ۔ریڈیو پہنچنے کے بعد اس نے بلوچی کو اہمیت دی ۔1967 میں اس نے عرب سرائیل جنگ پر بڑی زبردست نظم کہی ۔(حکیم بلوچ نے وہ نظم پڑھ کر سنائی)اس طرح پہلی بار اس نے سیاسی سطح پر اظہار خیال کیا۔

اس کے بعد اس کی جو انقلابی نظم تھی وہ بعد میں بی ایس او کا سلوگن بنی ۔ جو اس نے اس وقت کے سرکل میں بھی سنائی ۔یہ 1968 کا دور ہے ۔اُس وقت میں اولس کا ایڈیٹر تھا۔میں نے سن کر کہا کہ یہ تو معرکتہ الآرا نظم ہے ۔اس نے پوچھا تھا، چھاپو گے؟ میں نے کہا، ہاں ۔

ایک روز ہم لوگ گوشہِ ادب میں کتابیں دیکھنے گئے ۔عطا نے وہاں کے رسالے میں ویت نامیوں کا قومی ترانہ پڑھا۔اسے وہ اتنا پسند آیا کہ اس نے کہا یار میں بلوچی میں ایسا ترانہ لکھوں گا ۔پھر اس نے لکھا اور خوب لکھا۔پھر اسی ترانے سے ماخوذ اردو میں لوری لکھی ۔دونوں میں مخاطب بلوچ بچے ہیں لیکن دونوں میں لہجہ بہت مختلف ہے ۔ترانہ انقلاب سے معمور ہے اور لوری خوف سے مزین ہے ۔ لوری میں دشمن کو نیست و نابود کرنے کا خیال مفقود ہے اور ترانے میں اسی شدت سے موجود ہے ۔

اس دور میں عطا شاد میں ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ بلوچی میں وہ زبردست نظمیں لکھتا رہا جبکہ اردو شاعری اس نے مشاعروں کے لیے لکھی ۔جس سے اسے شہرت بھی ملی ۔ ہانی شہ مرید کی داستان کو اس نے بالکل نئے رنگ میں پیش کیا۔اس پر تنقید بھی ہوئی جو اکثر اسے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ۔اس کے ''میری زمیں پہ ایک کٹورہ پانی کی قیمت سو سال وفا ہے'' کی مثل کو نظم کرنے کو بہت سے بلوچوں نے بھی غلط انداز میں لیا۔اصل میں لوگوں کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ۔ یہاں سو سال سے مراد نسلوں تک وفا کا تسلسل ہے ۔

حکیم بلوچ نے کہا کہ بطور شاعر وہ ایک حساس فرد تھا اس لیے جو کچھ اردگرد ہوتا تھا اس سے وہ خود کو الگ تھلگ نہیں کر سکتا تھا ۔وہ جو محسوس کرتا تھا اس کا شاعرانہ اظہار کرتا تھا۔لیکن وہ علم کی اعلیٰ سطح

پر نہیں پہنچا تھا۔ نہ بہت زیادہ لٹریچر اس نے پڑھا تھا اور نہ تحریکوں سے اس کی کوئی وابستگی تھی ۔گو کہ اس کی ہمدردیاں ضرور تھیں لیکن وہ جو ہمہ وقتی یا عملی شرکت ہوتی ہے وہ نہیں تھی ......اور یہ میرا ذاتی خیال ہے ممکن ہے ایسا نہ ہو۔

ستمبر :

(1)

ستمبر 2008 میں جنرل باڈی /ایگزیکٹو کمیٹی کی مشترکہ میٹنگ صدر سرور خان کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں بڑا فیصلہ یہ کیا گیا کہ اب چونکہ تنظیم اپنی اوائلی ضرورتوں سے باہر نکل آئی ہے اور وہ صوبے کی ایک بالغ اور ذمہ دار ادبی سماجی تنظیم کا درجہ پا چکی ہے اس لیے ایگزیکٹو باڈی کی میٹنگ ماہانہ کی بجائے دو ماہی رکھ دی جائے ۔البتہ ''پوہ وزانت'' حسبِ معمول ماہانہ بنیادوں پر چلتا رہے ۔ میٹنگ میں ممتاز فلسطینی انقلابی شاعر محمود درویش اور اردو کے مزاحمتی مقبول شاعر، احمد فراز کے انتقال پر تعزیت کی گئی۔اجلاس نے نصیر آباد میں ہونے والی خواتین کی قتل (خواہ زندہ درگور والی خبر سچ ہو یا نہ ہو) کی مذمت کی ۔اور اِس فیوڈل علاقے کے اِس بہیمانہ قتل کو قبائلی کہنے کی تردید کر دی اور وہاں ریاست اور ریاستی اداروں کی عدم موجودگی کی مذمت کی گئی ۔

علاوہ ازیں بلوچستان یونیورسٹی کے لیکچرار کے کمرے کی تلاشی کی مذمت کی گئی ۔

(2)

ستمبر میں معروف ترقی پسند ادیب اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے راہنما راحت سعید کوئٹہ آیا تو سنگت اکیڈمی کی جانب سے ان کے ساتھ خصوصی مکالمے کا اہتمام کیا گیا جس میں مجموعی ملکی و بالخصوص بلوچستان کی صورتحال میں روشن فکر دانشوروں کی سرگرمیوں اور کردار سے متعلق مفصل بات چیت کی گئی ۔

سنگت اکیڈمی کے سیکرٹری جنرل وحید زہیر نے تعارفی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ہم گزشتہ دو برس سے فعال کام کر رہے ہیں ۔باہر سے بالخصوص جو ترقی پسند دوست آتے ہیں، ان سے بات چیت ہوتی رہتی ہے ۔ بلوچستان کے ایشوز پر بھی گفتگو رہتی ہے ۔سنگت کی باڈی کا ہر ماہ باقاعدگی سے اجلاس ہوتا ہے جبکہ پوہ و زانت کے نام سے فکری نشستوں کا ماہانہ اہتمام بھی ہے ۔اس کے

علاوہ بلوچستان کے دیگر علاقوں سے جو دوست آتے ہیں ان کے لیے ہم خصوصی نشست کا اہتمام کرتے ہیں۔آپ کو بھی ہم خوش آمدید کہتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ سے حوصلہ افزا گفتگو رہے گی۔

راحت سعید نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ اول تو مجھے خوشی ہے کہ بلوچستان کے ترقی پسند دوست ایک پلیٹ فارم پر یکجا ہیں۔ ارتقا کے حوالے سے میں مختصراً یہ بتاؤں کہ ارتقا کے اجرا کے بعد ہم نے ارتقا فورم بنایا۔پھر ارتقا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز بنایا اور یہ سب اپنی مدد آپ کے تحت تھا۔ہم نے خود ہی طے کیا کہ ہم بیرونی فنڈ نہیں لیں گے۔اس دوران اب تک ارتقا کے 45 پرچے آچکے ہیں۔انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سیمینارز اور مختلف کانفرنسوں کو ملا کر دو سو کے قریب تقریبات ہو چکی ہیں۔اور یہ سب ہم نے اپنی مدد آپ کے تحت کیا۔اس دوران یہ بات سمجھ میں آئی کہ ترقی پسند ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ پہلے ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا کہ مہینے میں ایک ادبی اور ایک سماجی تقریب کا اہتمام کیا۔گزشتہ برس ملتان میں وسیع پیمانے پر ایک سیشن ہوا۔ طے یہ ہوا کہ ترقی پسند ادیبوں کی جو تنظیمیں کام کر رہی ہیں انہیں تحلیل کرنے کی بجائے ، انجمن کا حصہ بنایا جائے۔تو اس طرح اس کی ایک ابتدائی شکل بنی۔اس وقت بھی پنجاب اور سرحد کے کئی اضلاع میں کام ہو رہا ہے۔کوشش یہ ہے کہ اس کے بعد وسیع پیمانے پر کنونشن کر کے انتخابات کروائے جائیں۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری نے اس موقع پر کہا کہ ہم سب مجموعی طور پر کسی ایک سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے جس کے کوئی مخصوص مفادات ہوں۔ ہم سب روشن خیال فکر سے وابستہ ہیں۔کس طرف ہونے کی بات ہے،تو اگر آپ عوامی لکھاری ہیں تو آپ عوام کے ساتھ ہیں اور جو عوام کو تکلیف دے رہے ہیں ان کے خلاف ہیں اور اگر آپ اس کے خلاف نہیں لکھ رہے تو آپ ترقی پسند کیسے ہیں؟ بات یہ ہے کہ جہاں سماج میں تبدیلی آ رہی ہو تو وہاں لوگوں کو پریشانی ضرور ہوتی ہے۔اس لیے کہ عام آدمی نئے پن کو ایک دم قبول نہیں کرتا۔گوریلا ،لڑائی اور بندوق ہمیں باپ دادا سے ملے ہیں،اس لیے ہم اسے پسند کرتے ہیں۔قرارداد، کہانی ،شاعری وغیرہ ذرا سست رو کام ہے،اس لیے عام آدمی اسے پسند نہیں کرتا۔

مڈل کلاس کی نفسیات ہے کہ جو قوت بھاری نظر آئے اس کا ساتھ دیتا ہے۔صبح بندوق

والے کا پلڑا بھاری دیکھا تو اس کے ساتھ ہو گیا۔شام کو بڑا کنونشن ہو گیا تو اس کے ساتھ ہو لیا۔لیکن اگر آپ عوام کے ساتھ ہیں تو یہ صاف ہے کہ آپ افریقہ کے نہیں ، پنجاب کے نہیں ، پشتونخوا کے نہیں ، اس سرزمین ، بلوچستان کے لکھاری ہیں۔آپ کی آواز انہی کے لیے ہے۔کم سہی ، کمزور سہی مگر ہونی چاہیے ۔آپ کسی بھی محاذ پر ہوں ،اصل سوال یہ ہے کہ آپ ''پرو بلوچ'' ہوں اور عوام کے ساتھ ہوں۔ہم اپنے پڑھے لوگوں کے ساتھ مل کر اسی مؤقف کو آگے لے کے جا رہے ہیں۔ یہ مشکل اور بڑا کام ہے،مگر ہمارا کام یہی ہے۔

بات یہ ہے کہ اچھے آدمی کے طور پر دنیا سے جانا چاہیے۔اور ایک اچھے آدمی کا فرض ہے کہ ایک آدمی جب بڑے دشمن سے لڑ رہا ہو تو اس سے ہمدردی کی جائے ، اس کا ساتھ دیا جائے۔ایسے مواقع پر چھوٹی موٹی غلطیوں کو آپ منظر عام پر نہیں لا سکتے۔ دیکھنا ضروری ہے کہ کون سی بات کب اور کہاں کرنی چاہیے۔ہم سمجھتے ہیں کہ اصل موت تو مؤقف کی موت ہوتی ہے۔

اس ساری گفتگو پر اظہار خیال کرتے ہوئے راحت سعید نے کہا کہ اس تمام مکالمے سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ انسان تو ہم ہیں اور انسانیت کے ساتھ ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہماری کمٹ منٹ لوگوں کے ساتھ ہونی چاہیے کہ ان کے دکھ درد کو سمجھ کر اپنا سکیں۔ پھر ہم عوامی ادیب ہیں۔ معاشرے میں مختلف خیالات کی حامل قوتیں برسر پیکار ہیں؛ لیکن جو ذات کے لیے نہیں، مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں، ان کی عزت کرنی چاہیے۔اگر ان سے ہمدردی سے رویہ نہیں ہو گا تو ہم عوام کے ساتھ نہیں ہوں گے۔کیونکہ لوگ دکھ میں مبتلا ہیں، تذلیل کا شکار ہیں۔بلوچستان میں علم کم ہے، غربت زیادہ ہے ۔یہی وہ مسائل ہیں جن کے لیے ہم نے الگ الگ راستے چنے ہیں۔اب یہاں کے دوستوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کے دکھ کو وہاں تک پہنچائیں۔اور جو اس دکھ کو نہیں سمجھتا، وہ انسان دوست نہیں ہے ۔لیکن ان تک چیزیں پہنچنی ضرور چاہئیں۔

اکتوبر:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے زیر اہتمام ماہانہ سنگت پوہ وزانت کا اہتمام 12 اکتوبر کی شام ہوا۔صدارت معروف شاعرہ اور اکیڈمی کی رکن جہاں آرا تبسم نے کی۔

وحید زہیر نے اپنا براہوئی افسانہ ''ملائک آ تا پٹ'' پیش کیا جس کا اردو ترجمہ افضل مراد نے

''ایک اندھیری رات کی کہانی'' کے عنوان سے پیش کیا۔افسانے پر تفصیلاً بحث کی گئی۔

اس کے بعد شعری حصہ میں ڈاکٹر علی کمیل قزلباش نے اپنی پشتو نظم پیش کی۔نظم پہ خوب بحث ہوئی اور حاضرین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

آخر میں صدر مجلس جہاں آرا تبسم نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ نظم خوب تھی۔اچھی بات یہ تھی ایک ناپختہ ذہن میں جو خیالات آتے ہیں وہاں سے شروع کیا اور پھر شعور آنے کے بعد جب خود کو پہچان لیا تو خدا کا احساس ہوا۔یہ ترتیب ہی شعور کی علامت ہے۔

سلطان ارشد القادری نے بھی ''ایک ادھوری نظم'' کے عنوان سے ایک نظم پیش کی۔

نومبر:

(1)

سنگت پوہ وزانت ،16 نومبر 2008 کو منعقد ہوا۔علی کمیل قزلباش نے صدارت کی۔عظیم انجم ہانبھی نے امر جلیل کے سندھی افسانے ''پکھی'' کا اردو ترجمہ ''پرندہ'' کے عنوان سے پیش کیا۔دوستوں نے اس کی تنقید میں مفصل اور مدلل گفتگو کی۔

(2)

سنگت اکیڈمی کا جنرل باڈی اجلاس،نومبر 2008 کو منعقد ہوا۔پریس سیکرٹری نے گذشتہ اجلاس کی کارروائی رپورٹ پڑھ کر سنائی جسے متفقہ طور پر منظور کرلیا گیا البتہ نئے ممبر پروفیسر بدل خان نے یہ نقطہ اٹھایا کہ جنرل باڈی کی میٹنگ کیونکہ نجی نوعیت کی ہوتی ہے اس لیے اسے پریس میں نہیں دینا چاہیے۔نکات الگ بنائے جائیں اور پریس میں اگر ضروری ہو تو جزو کی صورت میں الگ رپورٹ جاری کی جائے۔اس پر شاہ محمد مری نے کہا کہ رپورٹ شائع کرنے کا مطلب اپنے ممبران اور قارئین تک خبر پہنچانا ہے۔یہ ایسی کوئی خفیہ چیز بھی نہیں ہے کہ جسے پوشیدہ رکھا جائے۔اس سے دوست باخبر بھی رہتے ہیں اور ہم سب کی تربیت بھی ہوتی ہے۔

مختلف آرا کے بعد یہ طے پایا کہ فی الوقت اس سلسلے کو اسی طرح جاری رکھا جائے۔چند ماہ بعد اس کے اثرات دیکھ کر مزید فیصلہ کیا جائے گا۔

آخر میں معروف ترقی پسند شاعر جاوید شاہین کی وفات پر تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔

دسمبر:

سنگت پوہ و زانت ،28 دسمبر 2008 کی ماہانہ نشست منعقد ہوئی۔ڈاکٹر سعید مستوئی نے ایک غزل اور دو نظمیں پیش کیں۔ایک طویل اور جاندار تنقیدی بحث و مباحثہ ہوا اور اِن تخلیقات کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا۔

اس کے بعد سعید کرد نے اپنی ایک براہوی نظم پیش کی۔

بعد ازاں پروفیسر شاہ محمد مری نے پڑوسی ہندوستان کے ساتھ مناقشہ والے حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے ''جنگی قولنج'' کے عنوان سے اپنا تازہ مضمون پیش کیا،جس پر سیر حاصل بحث ہوئی۔

سال 2009

جنوری:

(1)

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی ایگزیکٹو باڈی کا اجلاس اکیڈمی کے صدر محمد سرور خان کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ڈپٹی سیکرٹری جنرل عظیم انجم ہانبھی نے اجلاس کے ایجنڈا کے نقاط پیش کیے۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری نے تجویز پیش کی کہ چونکہ سنگت اکیڈمی وفاقی سطح پر پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن سے ملحق ہے اس لیے ہر وفاقی یونٹ کے صوبائی صدر اور جنرل سیکرٹری کو سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی ایگزیکٹو کمیٹی کا نان ووٹنگ ممبر قرار دیا جائے۔اس تجویز کی بڑی گرمجوشی سے تائید کی گئی اور یہ بات متفقہ طور پر منظور ہوئی۔

آئندہ اجلاس کے لیے 22 مارچ 2009 کا دن طے ہوا جو کہ جنرل باڈی ہوگا اور جس میں تمام ممبران کو بلایا جائے گا۔

آخر میں مختلف اداروں کی جانب سے ترقی پسند موضوعات اور شخصیات کے حوالے سے تقریبات کے انعقاد پر ایک تعریفی قرارداد پاس کی گئی جس میں کوئٹہ میں ماہنامہ لیکوال کی جانب سے کاکاجی صنوبر کے فن و شخصیت کے حوالے سے سیمینار، نوائے بولان پبلی کیشنز کی جانب سے گل خان نصیر کی برسی پر تقریب اور اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے امن سیمینار پر ان اداروں اور

انتظامیہ کے لیے داد وتحسین کا اظہار کیا گیا۔

(2)

نامور صحافی اور وائس آف امریکہ سے وابستہ نفیسہ ہود بھائی اور اس کا شریکِ حیات جاوید بھٹو گذشتہ دنوں سنگت اکیڈمی کی ایگزیکٹو باڈی کی میٹنگ کے موقع پر تشریف لائے جہاں سنگت کے ساتھیوں کے ساتھ انہوں نے بین الاقوامی سیاسی صورتحال پر تفصیلی مکالمہ کیا۔

واشنگٹن میں مُقیم جاوید بھٹو نے اپنی تفصیلی گفتگو میں کہا کہ نائن الیون کے بعد امریکہ کی صورت حال خاصی بدل گئی ہے اور مسلمانوں کے خلاف روشن خیال امریکیوں کا روّیہ ایک دم انتہا پسندانہ ہو گیا ہے۔ وہ کسی بھی داڑھی والے آدمی کو مسلمان سمجھ کر ایک دم اس پر چڑھ دوڑتے ہیں حتیٰ کہ اُن دنوں اِس غلط فہمی میں کئی سکھوں کو قتل کیا گیا۔ نیز یہ کہ اسلام کو انہوں نے کھنگال ڈالا ہے، بے تحاشہ کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جارہی ہیں۔ آپ بس سٹال پر چلے جائیں آپ کو سینکڑوں کی تعداد میں اسلام پر کتابیں ملیں گی۔

ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ مسئلہ اصل میں تہذیبوں کے تصادم یا جنگ کا نہیں بلکہ سامراج کو خود کو زندہ رکھنے کے لیے ہمیشہ ایک دشمن کی ضرورت ہے۔ پہلے کمیونزم تھا؛ وہ اس کے خلاف لڑتے رہے۔ اب انہوں نے اپنا سارا زور اسلام پر لگا دیا ہے۔ امریکی اب اس پر بڑے خوش ہیں کہ ایک بڑا اور مستقل دشمن انہیں ہاتھ لگا ہے۔ اسی کے نام پر وہ الیکشن لڑتے ہیں، اسی کے نام پر ہتھیار بیچتے ہیں۔ امریکہ میں آپ جس محفل، جس ہوٹل پر چلے جائیں، لوگ آپ کو کہیں نہ کہیں اسی موضوع پر گفتگو کرتے اور بحث کرتے ہوئے ملیں گے۔

اس نے بتایا کہ لیکن امریکہ میں میڈیا بڑا افری ہے۔ سینکڑوں چینلز، ایف ایم اور اخبارات ورسائل ہیں۔ آپ کو اپنے خیالات کی ترویج کے تمام مواقع میسر ہیں لیکن اس کے باوجود وہاں کے اکثر لوگ بیرونی دنیا سے بے خبر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ایسے چینلز کی اکثریت ہے جو صرف مقامی حالات و واقعات پیش کرتے ہیں اور لوگوں کی اکثریت بھی انہی چینلز کو دیکھتی ہے۔ اصل میں امریکیوں کا مائنڈ سیٹ ایسا بنا دیا گیا کہ جہاں انفرادی زندگی کو اہمیت حاصل ہے۔ آپ اپنے آپ سے اپنے اردگرد سے مطمئن رہو، دنیا میں کیا ہورہا ہے؛ اس سے آپ کو غرض نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے امریکی

صرف امریکہ کو ہی دنیا سمجھتے ہیں کہ اپنا ملک اتنا وسیع ہے، سب کچھ میسر ہے، باقی دنیا کی کیا ضرورت ہے اور اسی لیے وہ اپنے ملک کی ناجائز پالیسیوں پر بھی چپ رہتے ہیں کیونکہ اسی میڈیا کے ذریعے انہیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ امریکہ جو کچھ کررہا ہے وہ انہی کے حق میں کررہا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ مجاہدین اور مسلمان ان کا جینا دوبھر کردیں گے۔

نفیسہ ہود بھائی نے کہا کہ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی کہ مسلمانوں کے خلاف اس قدر پروپیگنڈہ ہوتا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ امریکی صرف امریکہ ہی کے متعلق سوچتے ہیں۔ جس طرح کا ماحول وہاں بنایا گیا ہے، اس میں ہر امریکی اوّل و آخر صرف امریکی ہوتا ہے، وہ صرف اپنے لوگوں اور ملک کے متعلق سوچتا ہے۔ اسی لیے امریکی پالیسیوں کے خلاف دنیا بھر میں مظاہرے ہوتے ہیں لیکن خود امریکی اس کے خلاف کچھ نہیں بولتے۔

امریکن سنچری کے نام سے ایک ویب سائٹ پر یہ ساری تفصیلات موجود ہیں جس میں بش دور کے لوگوں نے یہ پلان بنایا کہ دو برس بعد نئی صدی آرہی ہے، اسے امریکن صدی ہونا چاہیے بلکہ اس کے بعد جو بھی صدی آئے وہ امریکن صدی ہونی چاہیے۔ اس دوران انہوں نے ایسی پلاننگ کی کہ پھر وہی لوگ اقتدار میں آئے اور افغانستان کو میدان جنگ بنایا۔ عراق کا جھوٹا ڈرامہ رچایا، جس کا اب وہ خود اعتراف کرچکے ہیں۔ اصل میں سارا معاملہ وسائل پر دسترس کا ہے اور یہ اتفاق ہے کہ تیل کے سب سے زیادہ وسائل مشرقِ وسطیٰ سے لے کر وسط ایشیا تک جہاں پائے جاتے ہیں۔ ان میں اکثریت مسلم ممالک کی ہے اور افغانستان اس میں بفرزون کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے محاذِ جنگ وُہی ہے اور امریکہ وہاں مستقل طور پر رہنا چاہتا ہے۔

یہ مکالمہ شام دیر گئے تک جاری رہا۔

آخر میں سنگت کے تمام دوستوں نے دونوں مہمانوں کی آمد اور گفتگو کا شکریہ ادا کیا۔ دونوں مہمانوں نے بھی سنگت کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا۔

(3)

رات جاگتے گزر گئی، برفباری جو ہوتی رہی............مست توکلی کا موسم کہاں سونے دیتا ہے۔ زمستانی بارش کے ایک ایک قطرے کی ٹپ ٹپ، جیسے محبوبہ کے نام کا ورد ہو رہا ہو۔ اب یہ تو ہو نہیں

سکتا کہ فطرت اپنی تمام مہربانیوں کو مجتمع کر کے آپ کے دل کو سکون آور بے سکونی عطا کر رہی ہو اور آپ سو پائیں۔

صبح وادی کپاس کی گھنی فصل دکھائی دے رہی تھی۔ زیرِ صفر درجہ حرارت، جاری ہلکی بارش، ننھے پرندوں کی مست چہچہاہٹ.........کھڑکی کے پاس بیٹھے نظم ہوگئی۔

مگر دل کی بھڑاس نہ نکلنا تھی، نہ نکلی۔ حسبِ حال چیز اٹھالی ترجمہ کرڈالی۔ یہ نرودا کی نظم تھی:Song of despair......

''لے اڑایا گیا قرار پھر بھی نہیں آیا۔ کمرہ چھوڑنا ہی حل تھا۔ بے مقصد و بے ارادہ و بے پروگرام چل پڑنا اور چلتے ہی رہنا بہت اچھا ہوتا ہے، حکیموں نے کہا۔''

عشاق کی سمجھ ہی تب آتی ہے جب آپ اُن کی راہ چلیں۔ مست آہٹ سنتے تو ہڑ بڑا جاتے کہ سموآئی ہے۔ دل کرتا ہے موبائل فون ٹرانس کانٹی ننٹل میزائل کی رفتار اور فاصلے پر پھینک دوں۔ کم بخت نے جھنکار کرنا ترک ہی کر دیا ہے۔ مخصوص صورت، مخصوص رنگت، مخصوص آواز اور مخصوص نشانی نہ ہوتو انسان بے ثمر کیکر کا درخت بن جائے۔ آج موبائل نے نہ بولنے کی ٹھان لی۔ اس سردی میں سنڈے پارٹی کینسل کہ عبداللہ جان کو اپنے کمرے سے بیٹھک تک آتے ہوئے بہت تکلیف ہوگی۔ بس، نکل پڑا۔ عظیم انجم ہانبھی جس نے آج کے پوہ وزانت میں شاعری پیش کرنی تھی، موبائل فون پہ تھا۔'' معاف کر دیں، نہیں آسکوں گا۔ گھر اور کمرہ پانی سے بھر چکا، اسے نکالنا ہوگا''۔ ہم نے منت کی کہ تبلیغی تو گھر گھر ہستی خدا کے حوالے کر کے چار چار ماہ کے لیے نکل پڑتے ہیں، آپ پندرہ منٹ کے لیے ہی آجاؤ''۔ عمر کا فرق کمسن کو دلیل بازی کرنے نہیں دیتی.......... یا سیدھا سیدھا بغاوت کرو یا پھر بڑے کی بات مان جاؤ۔ ہانبھی سفید ریشی کے ہاتھوں ہار گیا اور تربیلا ڈیم بنے گھر میں اپنے مسودات کو گوادری کشتیاں بنے چھوڑ کر آ ہی گیا۔ آگے جیسے حلوہ پڑا ہوا!!۔ ارے بھئی تنقیدی نشست تھی آگے۔ کان سرخ ہوجاتے ہیں، آنکھوں سے چنگاریاں نکلتی ہیں مگر پھر بھی خاموش رہ کر تنقید سنتے جاؤ۔ عجب رواج ہوتے ہیں جانکاری کے۔

ڈاکٹر عطااللہ بزنجو کی پہلی شرکت تھی۔ اس لیے تجویز کے باوجود صدارت اسے نہ ملی کہ یہ عام جلسے اور میٹنگ کی صدارت نہ تھی، جس میں کہ وہ ہم سب سے زیادہ ماہر تھا۔ ذرا سی مختلف

فارمیٹ والی نشست تھی۔ چنانچہ صدارت گئی ڈاکٹر سعید مستوئی کو تا کہ عطااللہ آئندہ صدارتوں کے لیے کوالیفائی ہو جائے۔ بس ایک دفعہ دیکھا، زندگی پڑی ہے؛ چاہے تو گوشہ نشینی کرو چاہے تو صدرنشینی۔ سر سلامت، ٹوپیاں بہت۔ ویسے بھی عطااللہ صدارت نہیں کرے گا تو قبروں سے لوگ لائیں گے کیا؟۔

تنقید کا پہلا پتھر تو مارا وحید زہیر نے۔ نظم تنقید کے لیے پیش کروا اور اس کی کاپیاں نہ کرو تو بھلا وحید چھوڑے گا؟ بھئی پانی تو بھر گیا گھر میں، بازار کی فوٹوسٹیٹ مشینیں تو موجود تھیں!! مگر اس ناترسی کے پیچھے ناقد کی چمکتی شرارتی آنکھیں تھیں اور لبوں پہ رفیقانہ مُسکان! تنقید بھی ہوگئی، اصلاح کا سامان بھی اور معصوم شرارت بھی۔

پہلی نظم کا عنوان تھا''Diplomacy''۔

زمانے کے خداؤتم!
مرے نزدیک نہ آؤ
مجھے معلوم ہے کہ تم
مجھے اخلاق کی باتیں بتاؤ گے
مجھے ہمدردیاں کرنے،
محبت سے عبادت تک،
ہر اک راستہ بتاؤ گے۔
مگر میرے زمانے کے خداؤتم!
مجھے بتلاؤ کہ تم نے کبھی خود بھی
محبت اور مروت کا،
عقیدت اور عبادت کا،
خلوص و مہر والفت کا،
کوئی عملی نمونہ بھی دکھایا ہے؟

اعتراض ہوا کہ نیچے نظم کا نفسِ مضمون ''منافقت'' ہے اور عنوان دیا گیا ہے ''ڈپلومیسی'' کا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ہم معنی لفظ نہیں ہیں۔ مگر کون مانتا ہے تیسری دنیا میں؟۔ سوشاعر نہ مانا اور

''ڈپلومیسی'' کے لفظ کو اُن معانی میں استعمال کرنے پر بضد رہا جو سیاست دشمن میڈیا اور حکمرانوں نے مشہور کروادیا: دھوکہ، منافقت، دوغلا پن کے معنوں میں۔ عنوان کے انگریزی لفظ پر بھی تنقید کی گئی کہ اردو میں ہم معنی بہت سے ایسے الفاظ موجود ہیں، مگر اس اعتراض کو پوری محفل نے مسترد کردیا کہ فیضؔ نے اردو نظم پہ ''ویبقی وجہ ربک'' والا عنوان رکھا۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اگر انگریزی عنوان نظم کو ابھار کر سامنے لانے میں مدد دے تو یہ بہت ہی احسن کام ہوتا ہے۔ ایک عمومی رائے یہ بھی تھی کہ ہماری اپنی مادری قومی زبانوں میں بھی عنوان رکھے جاسکتے ہیں۔

پھر نظم کے متن پر بات چھڑی۔ اس نظم میں مسئلہ یہ تھا کہ شاعر ہمارا جانا پہچانا اور ہر دلعزیز دوست تھا۔ وہ شاعر بھی اچھا ہے اس لیے جو توقع تھی کہ اگر معرکتہ الآرا نہ بھی ہو تو کم از کم اتنی گئی گزری بھی نہ ہو کہ اس میں شعریت ہی غائب ہو۔ کوئی چونکا دینے والی بات نہ تھی، ایسے ہی بغیر لیس کا آٹا توے پر ڈال دیا تھا۔ جو نہ جوار کی روٹی بنی نہ گندم کی۔ ایک بھاری موضوع کو شعری چاشنی کے بغیر انڈیل دیا گیا تھا۔ کوئی تراکیب واصطلاحات نہ آئیں، کوئی پسینہ نہیں بہا، وسعت کی کوئی گنجائش پیدا نہ کی گئی۔ نہ جانے شاعری میں لوگ کیوں جلد بازی کرتے ہیں۔

نظم کو اچھی کوشش قرار دینے والوں کی دلیل تھی کہ یہ منافقت کو بے نقاب کرنے والی نظم ہے۔ جہاں لوگ بولتے کچھ ہیں، عمل میں کچھ ہیں۔ اس کے علاوہ یہ نظم بنیادی طور پر عوام کے لیے ہے۔ سادہ، زود فہم اور ابلاغ سے بھرپور۔ نظم میں روانی ہے، شعری حسن موجود ہے اور یہ کہ خواہش و نظم کو خلط ملط نہ کیا جائے۔

وحید زہیر نے ایک نکتہ یہ اٹھایا کہ تنقیدی نشست میں ضروری نہیں کہ عوام الناس کی رائے کے پیچھے چلا جائے۔ ایسے بہت سے شاعر موجود ہیں جن کو عام قاری بہت پسند کرتے ہیں۔ مگر شاعروں سے پوچھیے، تنقید نگاروں سے پوچھیے تو بات ہی الٹی نظر آئے گی۔

صاحبِ کلام نے دوستوں کی تنقیدی آرا کو خوش آمدید کہا۔ اس نے اپنے عنوان کو برحق کہتے ہوئے کہا کہ اس عنوان کا پس منظر ہے، سیاسی حوالے سے، سیاسی رویوں کے حوالے سے۔ اپنی شاعری کے سہل اور آسان ہونے کا دفاع اس نے ورڈز ورتھ کی شاعری کی مثال دے کر کیا۔ نیکی اور بدی جب تک جاری رہیں گی، یہ موضوع اسی طرح جاری رہے گا۔ اس نے (غالباً قائل ہونے سے زیادہ محفل کا

دل رکھنے کے لیے) کہا کہ: ''میری نظم میں بہت زیادہ گہرائی نہیں ہے، مانتا ہوں''۔

پوہ وزانت کے صدر جناب ڈاکٹر سعید مستوئی نے دوستوں کی اس پرجوش شراکت اور بحث کو بہت ہی صحت مند قرار دیا۔ اور شاعر سے اپنی دوسری نظم پیش کرنے کی درخواست کی۔

عظیم انجم ہانبھی نے اپنی دوسری نظم بھی تنقید کے لیے پیش کی ۔ اس کا عنوان تھا: Decline۔

سمے کی پگ پہ
محبتوں کے حسیں قدم
خاروں کی وجہ سے
مزید آگے
دوام کی منزلوں پہ جانے کے قصد کو
ختم کرچکے ہیں
تمام ارادے بھی گردِ راہ ہو چکے ہیں
اور اب
یہاں سے آگے
محبتوں میں
زوال کی منزلوں کے سب سنگ میل
میری نظر میں پنہاں ہیں

اب یہ اُس کی قسمت کہ پچھلی نظم کے بالکل برعکس یہ نظم فکری الجھاؤ اور زبان کے الجھاؤ کا ایک شاہکار تھی۔ الفاظ کی نشست و برخواست شاعرانہ نہیں، نہ ہی کوئی ردھم موجود۔ دیر تک تو اس بات پر بحث ہوئی کہ یہ نظم ہے بھی کہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو پھر یہ آزاد ہے یا نثری۔ کمیل کی تشخیص تھی کہ آپ اسے نثری نظم کہہ سکتے ہیں۔ افضل نے خود کلامی والی اس نظم کو زیادہ ماڈرن ہونے کی وجہ سے تجریدیت کا شاہکار قرار دیا۔ بلوچستان میں ادب کا یہ بڑا ٹھیکیدار (ڈائریکٹر ادبیات پاکستان) اس نتیجے پر پہنچا کہ ''ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ رہے ہیں''۔

نظم کے نفسِ مضمون پر بھی اچھی خاصی بحث ہوئی۔ بہت کنفیوژن تھی نظم کے مفہوم میں۔ خیال، عدمِ تسلسل کا شکار ہے۔ مثلاً محبت کی راہ کب خاردار نہ ہوئی۔ راستے تو ہوتے ہی کٹھن ہیں، پوری انسانی ارتقا کی تاریخ ان کٹھن راہوں کو سہل کرنے میں لگی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر بزنجو کا کہنا تھا کہ شاعر رکا ہوا ہے، مایوسی کا شکار ہے۔ جبکہ وحید زہیر کے خیال میں اس نظم میں کوئی سمت، پیغام، بات کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ حبیب رند کی بھی شکایت یہ تھی کہ بات آگے نہیں بڑھ رہی ہے نظم میں۔

صاحبِ کلام عظیم انجم ہانبھی نے جواب دینے کے لیے کمر باندھ لیا۔ اس نے بہت اچھی بات کہی کہ محبت لطیف جذبہ ہے، مبتلا رہنے کو جی کرتا ہے۔ البتہ انہوں نے سارے الجھاؤ کا ذمہ دار خود کو نہیں بلکہ نظم میں موجود لفظ ''خار'' کو قرار دیا جس نے نظم کو پھنسا کر رکھ دیا ہے۔

اور میں نے سوچا کہ ''خار'' تو واقعی ''کوڑے مارے جانے'' کے لائق لفظ رہا ہے۔ صاحبِ صدر نے دوستوں کی زبردست بحث کا خیر مقدم کیا۔ اس نے محفل کی پیٹھ تھپکی کہ صرف واہ واہ کرنے سے خیال، فن (اور خود سماج) آگے نہیں بڑھتے۔

جھپک لپک کی زندگی گزارنے والے جناب جیئند جمالدینی نے ''ٹیررازم'' کے بارے میں مضمون پڑھنا تھا............ وہ **پوہ وزانت** کے آخری لمحوں میں آن پہنچا۔ اس نے اپنا مضمون صرف ہانپتے کانپتے پڑھا ہی نہیں، بلکہ اس نے اسے لکھا بھی ہانپتے کانپتے ہی تھا۔ یہاں تک کہ کوئی عنوان بھی نہ دے پایا اپنے مضمون کو۔

ظاہر ہے بحرِ منجمد شمالی سے لے کر بحرِ منجمد جنوبی تک پھیلے اِس مضمون پر بحث بھی بے ربط و بے سروپا ہونی تھی۔

منیر رئیسانی کا تبصرہ تھا کہ موضوع کوئی نیا نہیں ہے۔ کلاسیکل انداز میں لکھا گیا مضمون ہے۔ تمہید کو اس قدر پھیلا دیا گیا ہے کہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ حبیب رند نے اسے ''اچھا'' کہا۔ افضل مراد نے تو اس بات کو ہی خوشگوار قرار دیا کہ جیئند خان نے قلم اٹھایا۔ اس نے کہا کہ ایک فکری موضوع پر چھلانگ بازی بہت نظر آتی ہے، کہیں ٹِک کر بات نہیں ہوئی۔ اُس کے طرزِ تحریر کی بابت افضل نے درست کہا کہ لگے بندھے فقرے ہیں، کچھ اپنی طرف سے بات ہونی چاہئے تھی، ذاتی

رائے، ذاتی الفاظ ہونے چاہیے تھے۔ کتابی باتیں انسان کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتیں۔ عطا اللہ بزنجو کا موقف بھی یہی تھا۔

مگر وحید زہیر نطق و بُرہان کی آستینیں چڑھا کر جیئند خان کا دفاع کرنے کود پڑا۔ کہ جب تک قدیم تناظر میں نہیں دیکھیں گے آپ آج کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ سرد جنگ کا ذکر کیے بغیر چیزوں کو نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ ایران ضروری ہے، افغانستان ضروری ہے۔ ہم انسان کے ارتقا کو نہیں دیکھیں گے تو کچھ بھی نہیں سمجھ سکیں گے۔ اسے یقین تھا کہ مضمون نگار آگے چل کر relate کر پائے گا۔

جیئند کا کہنا تھا کہ اٹھان ٹھیک ہے۔ پس منظر ضروری ہوتا ہے۔

صاحب صدر نے کہا لگا جیسے ہم سبطِ حسن کو پڑھ رہے ہیں۔ اسامہ اور آئی ایس آئی کا نام آیا تو ہم خوش ہوئے کہ آپ بالآخر موضوع پر آ گئے ہیں۔ اگلی نشست میں ہم مضمون کا اگلا حصہ سنیں گے، 15 مارچ کو، جہاں حبیب رند شاعری پیش کرے گا۔

اپریل:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز جنرل باڈی کا اجلاس زیرِ صدارت محمد سرور منعقد ہوا۔

اکیڈمی کے جنرل سیکرٹری وحید زہیر نے اکیڈمی کے سال 2008 کی سالانہ رپورٹ پیش کی

:

''سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے انتخابات مارچ 2008 کو ہوئے تھے۔ اس کی ممبر شپ چھتیس ہے۔ گذشتہ سال کی طرح امسال بھی مجلسِ انتظامیہ اور ایگزیکٹو کے ممبران نے جذبے کے ساتھ کام کیا۔ اس تمام عرصہ میں سنگت اکیڈمی کی جانب سے سرگرمیاں جاری رہیں۔ ممبران کی تعداد بھی مناسب رہی اور سالانہ مقررہ فیس کی وصولی بھی بہتر رہی۔ **سنگت** کے کارواں میں شامل تمام عہدیداران و ممبران نہ تو کسی تعارف کے محتاج ہیں اور نہ ہی ان کی سماجی و ذاتی ذمہ داریاں ڈھکی چھپی ہیں۔ اس کے باوجود **سنگت** کی جانب سے پوہ زانت کی نشستیں ہوں یا ایگزیکٹو باڈی کے اجلاس ان کے انعقاد کی کارکردگی اطمینان بخش رہی۔ گذشتہ ایک سال میں پندرہ روزہ اور بعد میں ماہانہ اور دو ماہ کے وقفوں سے تقریباً 18 ایگزیکٹو باڈی کے اجلاس منعقد ہوئے۔

اسی طرح **پوہ زانت** کے انعقاد کے فیصلے کے بعد اب تک ماہانہ کے حساب سے 10

نشستیں منعقد ہوئی ہیں۔ **پوہ زانت** دراصل ادب کے طالب علموں کی ایک بیٹھک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ جس میں شامل دانشور اور ادیب اپنے تجربات، مشاہدات اور علم کی روشنی میں شریک گفتگو رہتے ہیں۔

پوہ زانت کے طفیل صوبے کے ادیبوں اور دیگر صوبوں سے آنے والے نامور ادیبوں کو سننے کا موقع ملتا ہے۔ اس حوالے سے جولائی 2008 میں یکے بعد دیگرے پشاور کے ادیبوں سے ادبی محافل کا موقع ملا جس میں پشتو اور اُردو کے نامور ادیب، دانشور سلیم راز، ڈاکٹر سہیل انشا اور پروفیسر حنیف خلیل کے ساتھ ادبی، لسانی اور سیاسی افکار پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ اسی طرح 20 جولائی کو پروفیسر غنی پرواز جو کہ بلوچی کے نامور افسانہ نگار ہیں کے ساتھ افسانہ نگاری کے عنوان سے ایک لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ ارتقا سوشل سائنسز کے بانی دانشور راحت سعید نے بھی ایک نشست میں خصوصی طور پر شرکت کی۔ اسی طرح ڈاکٹر فاطمہ حسن نے بھی سنگت اکیڈمی کی ایگزیکٹو کمیٹی کی میٹنگ میں خصوصی شرکت کی۔ عطا شاد کی بلوچی شاعری پر صوبے کے ممتاز دانشور حکیم بلوچ کے لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ بلوچ دانشور ڈاکٹر بدل خان کے ساتھ ایک یادگار نشست ہوئی۔ جنوری 2009 میں جاوید بھٹو اور ان کی رفیقہ حیات، وائس آف امریکہ اردو سروس کی پروڈیوسر نفیسہ ہود بھائی کے ساتھ علمی نشست ہوئی جس میں حالاتِ حاضرہ اور ادب پر سیر حاصل بحث ہوئی۔

پوہ زانت اور **ایگزیکٹو کمیٹی** کے اجلاسوں میں بلوچستان میں جاری سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی معاملات خصوصی طور پر زیر بحث رہے۔

جہاں ''سنگت'' رسالے کی باقاعدہ اشاعت جاری ہے، وہیں سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے تحت بعض اہم کتب کی اشاعت بھی جاری رہی۔

علاوہ ازیں سنگت اکیڈمی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کا ہر صوبائی صدر اور جنرل سیکرٹری ہماری ایگزیکٹو کمیٹی کے ''نان ووٹ'' ممبران ہوں گے۔

سنگت اکیڈمی آف سائنسز نے اس دوران دیگر ادبی اداروں کے ساتھ بھی قلمی و ادبی معاملات میں تعاون کا سلسلہ جاری رکھا۔ مختلف تنظیموں کی جانب سے منعقدہ سیمیناروں میں سنگت کی نمائندگی کی اور متفقہ فیصلوں کی روشنی میں اپنے مقالے بھی پیش کیے۔ کراچی میں ترقی پسند مصنفین کی

جانب سے منعقدہ ایک سیمینار میں سنگت کے وفد نے شرکت کی۔ لاہور میں اہلِ قلم کانفرنس کے موقع پر ترقی پسند مصنفین کے منعقدہ اجلاس میں بھی ہمارا وفد شامل تھا۔ اس طرح انڈیا، میں منعقدہ امن کانفرنس میں **سنگت** کی جانب سے محترمہ ڈاکٹر زینت ثنا نے نہ صرف شرکت کی بلکہ اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ انڈیا میں ایک اور امن کانفرنس میں سعید کرد نمائندگی کرنے جا رہے تھے۔ مگر وہ بوجوہ شرکت نہ کر سکے۔

سیکرٹری رپورٹ کے بعد مختلف ساتھیوں نے تجاویز و مشورے دیے۔ سلیمان کاکڑ نے کہا کہ سیاسی ڈائیلاگ کا اہتمام کر کے مختلف سیاسی رہنماؤں کو مدعو کرنا چاہیے۔ ہمارے پاس ایک سیاسی ڈائریکشن ہونی چاہیے۔ اس اجلاس میں حکمت عملی کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے کہ ہمارے اہل قلم کا نکتہ نظر کیا ہے؟۔ وحید زہیر نے کہا کہ تنظیم کی جانب سے کوششیں ہوئیں۔ بزنجو امن کانفرنسیں، نواب بگٹی و بالاچ مری کی شہادت کی وجہ سے نہ ہو سکیں۔ پروفیسر برکت صاحب نے کہا کہ سیاسی ایشوز کی بجائے نشستیں ادبی تھیں۔ پہلے ہمیں اپنے منشور کو دیکھنا چاہیے کہ سیاست سے **سنگت** کا کتنا تعلق ہے؟ وحید زہیر نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے جتنی نشستیں کی ہیں۔ ان میں مختلف سیاسی ایشوز پر بحث مباحثہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ زیارت کے زلزلہ کے حوالے سے بھی مباحثہ ہوا۔ اب ہمیں 2009 کے بارے میں لائحہ عمل طے کرنا ہے۔

ڈاکٹر سعید مستوئی نے کہا کہ سلیمان کاکڑ کی تجاویز **سنگت اکیڈمی** کو ایک NGO کی شکل دینا ہے جو کہ کم از کم ہم جیسے روشن خیال ادیبوں کو زیب نہیں دیتا۔ جہاں تک فنڈنگ کی بات ہے، ہمارے اپنے دوستوں کے چندے ہمارے لیے کافی ہیں۔ سنگت رفیق نے کہا کہ بیرونی ڈونرز پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ سلیمان کاکڑ نے کہا کہ میرا مقصد **سنگت اکیڈمی** کو NGO بنانا نہیں جبکہ بیرونی یونیورسٹیوں میں مختلف قومی زبانوں پر ریسرچ کے مواقع ہیں، ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

افضل مراد نے کہا کہ ہم نے ہر ایشو پر مذمتی و حمایتی قرار دادیں منظور کروائی ہیں جو کہ ہماری سوچ کا مظہر ہے۔ 2008ء میں ہماری کمزوریاں رہی ہیں۔ اب ہمیں اپنی کمزوریوں کی اصلاح کرنی چاہیے۔ وحید زہیر نے کہا کہ ہماری نشستیں اور لیکچرز **پوہ زانت** میں آتے ہیں۔ اور یہ زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ ادب کے حوالے سے ہمیں ڈاکٹر علی کمیل قزلباش کو یہ ذمہ داری دینی چاہیے کہ وہ ادبی

نشستوں اور لیکچرز کا اہتمام کریں۔سعید کرد نے کہا کہ جیسا کہ سنگت اکیڈمی کا سالانہ بزنجو امن میلہ گزشتہ دو سالوں سے بلوچستان کی سیاسی صورتحال کی وجہ سے تعطل کا شکار ہے۔لہٰذا اب 31 مئی کو میر یوسف عزیز مگسی کی برسی کے حوالے سے کتابوں کی تقریب رونمائی کے ساتھ ساتھ مست توکلی و رحمان بابا پر سیمینار کا انعقاد کرنا چاہیے۔اجلاس میں سنگت اکیڈمی کے آئین میں ترامیم کی منظوری دی گئی۔

قراردادیں:

1۔اجلاس پشتو کے عظیم صوفی شاعر رحمان بابا کے مزار پر بم دھماکے کی مذمت کرتا ہے۔

2۔اجلاس بلوچ دانشور جان محمد دشتی پر قاتلانہ حملہ کی مذمت کرتا ہے۔

3۔ڈاکٹر علی کمیل قزلباش کے والد کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کرتا ہے۔

آخر میں سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے سرپرست اعلیٰ ماما عبداللہ جان جمالدینی کی نیک خواہشات کا پیغام سنایا گیا۔

مئی:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے زیراہتمام ماہانہ پوہ و زانت کے سلسلہ میں جامعہ بلوچستان کے شعبہ بلوچستان سٹڈی سینٹر کے تعاون سے ''کلچر اور شناخت'' کے عنوان سے ایک لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔جس میں یونیورسٹی کے طلبہ وطالبات سمیت، پروفیسرز، ادبا اور دانشوروں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔علاوہ ازیں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر معصوم یاسین زئی نے بھی خصوصی طور پر شرکت کی۔نظامت کے فرائض بلوچستان سٹڈی سینٹر کے سینئر ریسرچ آفیسر اور سنگت اکیڈمی کے رکن پروفیسر غلام نبی ساجد بزدار نے ادا کیے۔

سب سے پہلے اکیڈمی کے جنرل سیکرٹری جناب وحید زہیر نے سنگت اکیڈمی کا تعارف پیش کیا۔جس کے بعد پروفیسر بدل خان بلوچ لیکچر کے لیے ڈائس پر آیا۔

پروفیسر بدل خان یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں پروفیسر رہا۔وہ بلوچستان یونیورسٹی میں پرو وائس چانسلر کے عہدے پر بھی رہا۔اس نے اپنے لیکچر میں کہا کہ کلچر انسان کے سماجی، تہذیبی اور مذہبی ارتقا کی پیداوار ہے۔ہر سماج کی اپنی مخصوص اقدار ہوتی ہیں جس سے وہ اپنی شناخت کا اظہار کرتا ہے،اسی سے کلچر کی ترویج ہوتی ہے۔لوگ اس پر فخر کرتے ہیں۔انیسویں صدی سے پہلے کلچرل برتری

اور کمتری کی بات ہوتی تھی لیکن بعدازاں کلچرل اینتھراپالوجسٹوں نے مختلف کلچرز کے تقابلی مطالعہ کی اہمیت کو اجاگر کیا کہ آپ جو کچھ کرتے ہیں،وہ ٹھیک ہے لیکن آپ یہ بھی جانیں کہ دوسرے کلچر کے لوگ کیا کرتے ہیں۔دراصل کلچر میں کوئی چیز منفی نہیں ہوتی۔یہ ایک غیر سائنسی اصطلاح ہے۔

اس نے کہا کہ کلچر دراصل ہم اپنے آباؤاجداد سے وراثت میں ملنے والی اقدار کو کہتے ہیں جو بنیادی طور پر ہمارے سماجی رویوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتا ہے۔لیکن پھر یہ سوال اٹھایا گیا کہ اگر بات صرف رویوں کے تجزیے کی ہے تو کیا کلچر صرف انسانوں کا ہے؟ پھر تو جانوروں کا بھی کلچر ہونا چاہیے۔ پھر تو چیمپنزی کا بھی کلچر ہونا چاہیے۔لیکن تجربات کے نتیجے میں یہ کہا گیا کہ جانور محض تجربے سے سیکھتا ہے اور انسان نے سوچ کر، تجزیہ کر کے سیکھا ہے۔

کچھ چیزیں گلوبل ہیں اور لگ بھگ دنیا کے ہر کلچر میں پائی جاتی ہیں۔جیسے مردے کو عموماً باہر نہیں پھینکا جاتا، ماں بہنوں سے کوئی شادی نہیں کرتا، انسانوں کی عزت کرنا وغیرہ۔البتہ ہر قوم کی اپنی مخصوص ثقافتی اقدار ہیں۔مثلاً ہمارے ہاں مہمان کی حفاظت کرنا کلچر کا حصہ ہے۔اس کی حفاظت کے لیے جان دینا یا اس کا انتقام لینا...... جو ایسا نہیں کرتا اسے کلچر سے خارج تصور کیا جائے گا۔

کلچرل گروپس اپنے کلچرل نارمز کو مضبوط بنانے اور منوانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔جیسے یورپ میں کھانوں کے، ڈانسز کے، میوزک کے باقاعدہ فیسٹول ہوتے ہیں۔مقصد خود کو منفرد دکھانا ہوتا ہے کہ ''جس میں یہ سب ہے، وہ ہم میں سے ہے''۔

کلچرل ایکسپریشن (اظہار) کے ذریعے بھی کلچرل گروہ اپنے اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہیں؛ جیسے مچھیرے بڑی کشتی کو شکار کے بعد ساحل پر لانے کے لیے مل کر ایک گیت گاتے ہیں۔چاول کے کھیت میں مل کر زہیروک گایا جاتا تھا۔ایک آدمی گا کر ختم کرتا ہے تو دوسرے کھیت سے دوسرا آدمی گانا شروع کر دیتا ہے۔اسی طرح عورتیں صبح سویرے اٹھتی ہیں تو چاول پینے کے دوران مل کر گاتی ہیں۔

دراصل کلچر میں کوئی کمتر یا برتر نہیں ہوتا۔سب میں سب کچھ ہے، کچھ میں زیادہ کچھ میں کم۔

یورپ میں جب 80 اور 90 کی دہائی میں رومینٹک نیشنلزم کا دور چلا تو ہر قوم کوشش کرتی کہ اپنی اصل اور خالص چیزیں دریافت کرے۔فن لینڈ اس کی مثال ہے۔اصل میں نو آبادی کو ہمیشہ شناخت کا خطرہ ہوتا ہے۔وہ معیشت سے بھی زیادہ اسے اہمیت دیتے ہیں کہ دنیا کو دکھایا جا سکے کہ ہم

بھی قوم ہیں، چاہے پیٹ میں کچھ بھی نہ ہو۔

دوسری چیز کلچرل ہیری ٹیج (ثقافتی ورثہ) ہے۔ جیسے لوگ بالاچ کا نام رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بھی وہی کریں گے، باہوٹ کے لیے جان دیں گے۔ اس کلچرل ہیری ٹیج کو آج بھی بلوچ شاعر مزاحمت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اور دنیا میں لوگ کلچرل ہیری ٹیج کو مزاحمت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

کلچر کا معیشت سے بھی براہ راست تعلق ہے۔ امریکن اس کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مثلاً انگریز جب یہاں آئے تو انہوں نے جاسوسوں کو بھیجا کہ آپ معلوم کریں کہ لوگوں کو کیا اچھا لگتا ہے کیا نہیں۔ کیسے کھاتے ہیں، کیسے ملتے ہیں۔ لوگ اصل میں نسلوں سے اپنی اقدار کے عادی ہیں جو اس کو اپنائے گا وہی جلد اس کا حصہ بنے گا۔ جو ایسا نہیں کرے گا وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ آج ملٹی نیشنل کمپنیاں اسی طرح اپنے نمائندے بھجواتی ہیں مثلاً کوئٹہ میں کام کرنا ہے تو پہلے آپ دیکھیں کہ کتنی قومیتیں رہتی ہیں؟ کون لوگ ہیں؟ کیسے رویے ہیں؟ آپ خاتون ہیں تو کپڑے کیسے پہنیں گی؟ وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور چیز کلچرک شاک ہے کہ آپ ایک کلچر سے دوسرے کلچر میں چلے جائیں تو وہاں آپ کو ایسی چیزیں دیکھنے کو ملیں جو آپ کے ہاں معیوب ہوں تو اس سے کلچرل شاک پہنچتا ہے۔ اس لیے کلچرل اینتھراپالوجسٹ کا کام یہی ہے کہ وہ مختلف کلچرز کا مطالعہ کر کے ان کا تقابلی جائزہ لے اور عوام کے سامنے پیش کرے تا کہ کلچرل شاک کے امکانات کو کم کیا جا سکے۔ اس لیے دنیا جس گلوبل ٹینٹ کی طرف جاری ہی ہے وہاں اس کی زیادہ ضرورت ہوگی۔

آخر میں اس نے کہا کہ دوسروں کی زبان بولنا اور ثقافت کا احترام اچھی بات ہے لیکن دوسروں کی ثقافت کو نقل کرنا یا قبول کرنا خطرناک ہے۔

آخر میں وائس چانسلر ڈاکٹر معصوم یاسین زئی نے اظہار خیال کیا اور سنگت اکیڈمی و بلوچستان سٹڈی سینٹر کی اس مشترکہ کاوش کو سراہتے ہوئے اس کے تسلسل کی خواہش کا اظہار کیا۔

جولائی:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی ایگزیکٹو باڈی کا اجلاس 19 جولائی 2009 کو منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت اکیڈمی کے صدر محمد سرور خان نے کی۔

سنگت اکیڈمی کی کتب کی مارکیٹنگ کے حوالے سے عابد میر نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے ریڈرز کلب کا ایک آئیڈیا رکھا ہے کہ عمومی طور پر ہم باہر سے چھپنے والی کتابیں خریدتے رہتے ہیں لیکن اپنے دوستوں کی کتابیں مفت میں ملنے کی توقع رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ ایک تجویز ہے کہ اکیڈمی کی یا اکیڈمی کے کسی بھی دوست کی کوئی کتاب شائع ہو تو کم از کم اکیڈمی کے تمام ممبران کے لیے یہ لازمی قرار دیا جائے کہ وہ ڈسکاؤنٹ پر اس کی ایک کاپی ضرور خریدیں۔ شاہ محمد مری نے کہا کہ پبلشر مافیا کا زور کسی طرح نہیں ٹوٹ رہا۔ وہ لکھنے اور پڑھنے والے دونوں کا استحصال کر رہا ہے۔ سرور خان نے کہا کہ اکیڈمی کے ممبر کی کوئی کتاب شائع ہو تو اسے ممبران کو مفت کاپی نہیں دینی چاہیے اور ہر ممبر کم از کم ایک کاپی ڈسکاؤنٹ پہ خرید لے۔ کلیم خان نے کہا کہ اس کا ایک طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ جیسے کوئی نئی کتاب آئے تمام ممبران کو مسیج (SMS) کر دیا جائے کہ فلاں کتاب اتنے ڈسکاؤنٹ پر موجود ہے۔ سنگت کے آفس سے کاپی حاصل کر لی جائے۔

اس پر تمام دوستوں نے اتفاق رائے کر لیا اور طے یہ پایا کہ سنگت اکیڈمی کے کسی بھی ممبر کی کتاب تمام ممبران خرید کر پڑھیں گے۔ مفت کتاب لینا معیوب تصور ہوگا۔

* بعدازاں جنرل باڈی اجلاس اور انتخابات کے حوالے سے سیر حاصل بحث کے نتیجے میں ہر دو ایونٹ کے لیے مشترکہ طور پر درج ذیل شیڈول طے پایا۔

جنرل باڈی اجلاس ہوگا اسی میں انتخابات کا انعقاد ہوگا جس میں آئندہ دو برس کے لیے کابینہ منتخب کی جائے گی۔ اجلاس 9 اگست 2009 بروز اتوار اکادمی ادبیات کے آفس میں ہوگا۔ افضل مراد الیکشن کمیٹی کا سربراہ ہوگا۔

— وہ تمام ممبران جن کی سالانہ فیس ادا نہیں ہوئی 15 اگست تک اپنی فیس جمع کرا سکیں گے۔

— امیدوار انتخابات میں حصہ لینے کے لیے کاغذات نامزدگی الیکشن کمیٹی سے 25 جولائی سے حاصل کر سکیں گے۔

— کاغذات نامزدگی 6 اگست تک جمع ہو سکیں گے۔

— 7 اگست کو کاغذات کی جانچ پڑتال ہوگی۔

— 8 اگست کو امیدواروں کی حتمی فہرست کا اعلان کیا جائے گا۔

جبکہ آئندہ پوہ وزانت کی نشست 16 اگست کو ہوگی۔
آخر میں اکیڈمی کے ممبر پروفیسر برکت علی کے کزن، نیز عالمی پاپ فنکار مائیکل جیکسن کی وفات پر اکیڈمی کی جانب سے تعزیتی قرارداد پاس کی گئی۔

اگست:

(1)

تیسرے انتخابات

گیارہ اگست 2009 کو سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے انتخابات عمل میں لائے گئے ۔واضح رہے کہ اکیڈمی تواتر کے ساتھ اپنے انتخابات کرتی رہتی ہے۔یہ الیکشن ہر دو سال بعد منعقد ہوتے ہیں۔اس بار یہ تیسرے الیکشن تھے۔

اکیڈمی ادبیات کے ہال میں تنظیم کے صدر جناب محمد سرور آغا کی صدارت میں جنرل باڈی کے اجلاس نے اپنی رسمی کاروائی نمٹانے کے بعد کاروائی الیکشن کمشنر جناب افضل مراد کے حوالے کر دی ۔اس بار کابینہ تقریباً ساری نئی منتخب کی گئی۔

محمد سرور آغا کی جگہ ممتاز دانشور اور براہوی اور اردو کا لکھاری محترم وحید زہیر نیا صدر بن گیا۔نائب صدر اول کی حیثیت سے ڈاکٹر عنبرین مینگل کی جگہ اس بار اردو اور سندھی کی ممتاز شاعرہ محترمہ جہاں آرا تبسم نے لی۔

فارسی، پشتو اور اردو کے شاعر و محقق اور شعبہ فارسی بلوچستان یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر علی کمیل قزلباش کو نائب صدر دوم چُنا گیا۔ڈاکٹر صاحب تہران یونیورسٹی کا پی ایچ ڈی ہے۔

نیا جنرل سیکریٹری اردو اور براہوی کا ممتاز شاعر اور اسسٹنٹ پروفیسر بولان میڈیکل کالج ڈاکٹر مُنیر رئیسانی چُنا گیا۔سرائیکی اور اردو کے ممتاز دانشور ڈاکٹر سعید مستوئی نے جوائنٹ سیکریٹری کا عہدہ سنبھال لیا۔ براہوئی کا ترقی پسند شاعر محترم سعید کُرد آفس سیکریٹری منتخب ہوا۔صرف دو صاحبان عابد میر اور کامریڈ کلیم اپنے سابقہ عہدوں یعنی پریس سیکریٹری اور خزانچی کے بطور دوبارہ منتخب ہوئے۔

نئی ایگزیکٹو کمیٹی کے منتخب شدہ احباب کے نام یوں تھے:

ڈاکٹر بدل خان بلوچ پرو وائس چانسلر یونیورسٹی آف بلوچستان ہے جو اٹلی کا پی ایچ ڈی

ہے۔ بلوچستان اور فولکلور پر اُس کے بے شمار تحقیقی مقالے بین الاقوامی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔پروفیسر اکرم دوست ڈین سوشل سائنسز یونیورسٹی آف بلوچستان؛ ہمارے منطقے میں فائن آرٹس کا درخشاں ستارہ ہے۔پروفیسر برکت علی آئی ٹی یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔وہ بلوچستان میں یونیورسٹی سطح کی درس وتدریس میں ربع صدی سے مصروف عمل ہے۔

جیئند خان جمالدینی ٹریژرار بلوچستان یونیورسٹی، محمد سرور آغا، دانیال طریر لیکچرار اردو ڈپارٹمنٹ یونیورسٹی آف بلوچستان۔

الیکشن کمشنر جناب افضل مراد نے نو منتخب اراکین سے مندرجہ ذیل متن کا حلف لیا:

''میں ....بحیثیت..................سنگت اکیڈمی آف سائنسز میں علمی، ادبی اور سماجی سطح پر ترقی پسند سوچ کی نمائندگی کرتے ہوئے حتیٰ الوسع خدمات سرانجام دوں گا اور سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے اصول وضوابط کی پاسداری پورے خلوص وایمانداری کے ساتھ کرتا رہوں گا''۔

بعدازاں کاروائی نئے جنرل سیکریٹری کے حوالے کی گئی جس نے نو منتخب صدر کی زیر صدارت جلسے کی کاروائی شروع کی۔تنظیم کے نئے دوستوں نے احباب کے اعتماد پر پورا اترنے کا عہد کیا اور پچھلی کابینہ کے کا کام کو سراہا۔

سنگت اکیڈمی کی روایت ہے کہ دوسرے صوبوں میں ترقی پسند تنظیموں کے صوبائی صدر اور جنرل سیکریٹری اِس کی ایگزیکٹو کمیٹی کے اعزازی ممبر تصور ہوتے ہیں۔اس سلسلے میں صوبہ پختونخواہ میں پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کے صوبائی صدر پروفیسر ناصر علی سید اور جنرل سیکریڑی محترم شہاب الدین،، سندھ سے سندھی ادبی سنگت کے جنرل سیکریٹری یوسف سندھی اور پنجاب سے پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن سے وابستہ جناب پروفیسر رشید مصباح اور عابد حسین عابد سنگت اکیڈمی کی ایگزیکٹو کمیٹی کے اعزازی ممبر بنا دیے گئے۔

(2)

سنگت پوہ زانت 16 اگست کی شام ہوا۔ پوہ زانت کے انچارج ڈاکٹر علی کمیل قزلباش نے حاضرین کو بتایا کہ اس بار پوہ زانت کے تنقیدی اجلاس کے طریقہ کار میں کچھ تبدیلی کی گئی

ہے جیسا کہ عمومی طور پر دوست اپنی تخلیقات پیش کرتے ہیں اور اس پر تنقید ہوتی ہے۔لیکن صاحبِ تحریر معلوم ہونے کے باعث اکثر ہم مروت سے کام لیتے ہیں یا پھر اپنا اپنا بغض نکالتے ہیں۔اس لیے اس دفعہ ذرا سی تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ جو تخلیقات پیش کی جائیں گی ان کے تخلیق کاروں کا نام مخفی رکھا جائے گا اور آخر میں بعد اَز تنقید تخلیق کار کا نام سامنے لایا جائے گا۔

اس کے بعد اس نے پہلے ایک غزل اور پھر ایک نظم تنقید کے لیے پیش کی جن پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔غزل کے ہر شعر پہ الگ الگ بحث کی گئی۔

دوسرے حصے میں 'محبت عام کر ڈالیں' کے عنوان سے نظم پیش کی گئی جس پر حاضرین نے اظہار خیال کیا۔

آخر میں بتایا گیا کہ نظم کا خالق ڈاکٹر علی کمیل قزلباش تھا جس نے تمام حاضرین کی آرا کا شکریہ ادا کیا۔

(3)

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی نومنتخب کابینہ کی ایگزیکٹو باڈی کا پہلا اجلاس 16 اگست کی شام اکیڈمی کے نئے صدر وحید زہیر کی صدارت میں ہوا۔جس میں اہم تنظیمی فیصلے کیے گئے۔

ستمبر:

سنگت پوہ وزانت کی ماہانہ نشست منعقد ہوئی۔جس میں جامعہ بلوچستان میں بلوچستان سٹڈی سنٹر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبدالرزاق صابر نے اردن میں اپنے تین سالہ قیام کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔

ڈاکٹر رزاق صابر نے کہا کہ اُردن کا رقبہ بلوچستان جتنا ہی ہے،6 ملین آبادی ہے۔اس کی سرحدیں دیگر عرب ممالک،شام سعودی عرب اور اسرائیل وغیرہ سے ملتی ہیں۔چھوٹا ملک ہونے کی وجہ سے لوگوں سے رابطہ آسانی سے ہو جاتا ہے۔اس خطے میں بیروت وہ پہلا شہر تھا جس نے سب سے پہلے جدید شہری زندگی کا اسلوب اپنایا۔

وہاں دو طرح کے لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا؛ایک بدو عرب اور دوسرے رومن لوگ جو غریب تھے لیکن ایک طویل عرصہ سے یہاں رہائش پذیر ہیں۔وہاں قدیم رومن لوگوں کے طرزِ

تعمیر کے نشانات بھی تھے اور وہاں کئی مقامات پر چٹانوں کو کاٹ کر سٹیڈیم بنائے گئے ہیں۔وہاں سرخ رنگ کی ایک بڑی چٹان ہے۔کہتے ہیں کہ قدیم لوگوں نے ان چٹانوں کو کاٹ کر شہر بنایا تھا۔مذہبی طور پر اسے وادیٔ موسیٰ بھی کہتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ یہیں تبلیغ کیا کرتا تھا۔یہیں حضرت ہارون کا مزار بھی پہاڑی کے اوپر ہے۔عربوں کے لات ومنات کے بت بھی وہیں رکھے گئے ہیں۔

اردن کا ایک بڑا ذریعہ آمدن سیاحت ہے۔سیاحوں کے لیے قابل دید چیزوں میں ایک ڈیڈسی ہے جسے بحرِ مردار بھی کہتے ہیں۔اس کا پانی اتنا نمکین ہے کہ اس میں کوئی جاندار نہیں رہ سکتا۔ڈوبنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔آپ اس کے اوپر لیٹ سکتے ہیں۔لوگ سمندر کے اوپر لیٹ کر کتابیں پڑھتے ہوئے شوق سے تصویریں بنواتے ہیں۔اس میں نمکیات اتنی ہے کہ اس سے بننے والی اشیا،کریم وغیرہ مہنگے داموں فروخت کی جاتی ہیں۔اور لوگ بڑے شوق سے خریدتے ہیں۔اس کا ایک حصہ فلسطین میں ہے۔

جورڈن والے خود کو خالص قریشی کہتے ہیں۔عرب قبائل اکثر ناموں سے معروف ہیں؛ جیسے ایک قبیلہ جوار ہے۔عرب میں جوار ہمسائے کو کہتے ہیں۔اردو والا قرب و جوار اسی سے بنا ہے۔کہتے ہیں کہ یہ لوگ کسی زمانے میں بیت اللہ کے پاس رہتے تھے۔اس نسبت سے جوار کہلائے یعنی بیت اللہ کے ہمسائے۔

عربی زبان کے دو بڑے لہجے ہیں فصیح اور عامیہ۔فصیح خالص اور مستند ہے جبکہ عامیہ سے مراد عمومی بول چال کی زبان ہے۔مصر والوں نے بالخصوص عربی زبان کو بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ان کے ہاں ''ج'' کی جگہ ''گ'' رائج ہو گیا ہے۔وہاں جمیل، گمیل ہو جاتا ہے۔اس لیے انہیں عربی سیکھنے کے لیے اُردن بھیجا جاتا ہے۔

سیاحت کے فروغ کے لیے انہوں نے کئی طریقے ایجاد کیے ہیں۔باہر کے سیاحوں کے لیے پیکج ہے کہ اگر آپ تین دن کسی بدو کے ہاں گزاریں گے تو آپ کو اتنے پیسے دینے پڑیں گے۔انہوں نے بدو کے مصنوعی خیمے اور مکمل رہائش بنائی ہوئی ہے۔وہ گدان بالکل بلوچ کے گدان کی طرح ہیں۔جب تک وہ آپ سے عربی میں بات نہ کریں آپ محسوس نہیں کریں گے کہ وہ بلوچ کا گدان ہے یا عرب بدو کا۔اسی طرح مہمان نواز ہیں بہت زیادہ۔ان کے ہاں ایک مثل ہے کہ ''مہمان آنکھ سے

کھاتا ہے، منہ سے نہیں''۔ یعنی اہتمام خوب کرنا ہے۔ خود بھوکا رہ کر بھی اُسے خوب کھلانا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مہمان بھی ایسے موقع پر کم کھاتا ہے۔ یہ جتانے کے لیے کہ میں کوئی نادیدہ نہیں ہوں۔ اور یہ مشہور ہے کہ دعوت والے اکثر گھر جا کے کھانا کھاتے ہیں۔

عربوں کے ہاں ایک خاص ڈش ہے'' منصب''۔ اس میں گوشت اور شوربہ الگ الگ کرتے ہیں پھر چاول پکاتے ہیں۔ اسے ایک بڑے تھال میں ڈالتے ہیں جس میں سات آٹھ لوگ ایک ساتھ کھاتے ہیں۔ ایک اور بات یہ کہ جب بھی کوئی نیا مہمان آئے تو اس کے آتے ہی ایک خاص مشروب پیش کیا جاتا ہے جو کافی سے بنایا جاتا ہے۔ وہ اسے قہوہ کہتے ہیں۔ آپ دفتر، گھر، دکان جہاں چلے جائیں، یہ خاطر مدارت ضرور ہوگا اور اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ پینے کے بعد جب تک آپ اسے ہلائیں گے نہیں، وہ بار بار اس میں ڈالتا رہے گا۔

کوئی بہت عزیز آدمی آجائے تو اس کے لیے پورا اونٹ ذبح کیا جاتا ہے جیسے مکران میں کوئی خاص مہمان چلا جائے دیہات میں تو اس کے لیے کھجور کا پورا درخت کاٹ کر اس کی جڑ سے ایک خاص گودہ نکالا جاتا ہے جسے کوش کہتے ہیں۔ یہ اصل میں یہ جتانا ہوتا ہے کہ آپ اتنے اہم ہیں کہ آپ کے لیے پورا درخت کاٹا جا رہا ہے۔

تعلیم وہاں تین درجوں میں ہے؛ مدرسہ، کلیہ اور جامعہ۔ مدرسہ چھٹی جماعت تک ہے اور کلیہ بارہویں تک۔ پرائمری تک تعلیم لازمی اور مفت ہے جبکہ یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم انتہائی مہنگی ہے۔ چار ماہ کے ایک سمسٹر کی فیس پاکستانی ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔ اس طرح صحت کی سہولیات بھی اتنی مہنگی ہیں۔ تمام بڑے تعلیمی وطبی ادارے، پرائیویٹ سیکٹر میں ہیں۔ اس لیے اکثر لوگ کالج سے اوپر نہیں جا سکتے۔ اصل میں طبقاتی طور پر دو بڑے کلاس ہیں۔ لوئر کلاس اور اَپر کلاس۔ مڈل کلاس نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح زراعت نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھل بہت ہیں۔ زیتون اور کیلے کی بہتات ہے۔ عجیب یہ ہے کہ ایک ہی سیزن میں مختلف پھل مل جاتے ہیں جیسے کہ سیب ہے اور انار بھی، انگور بھی۔

ادب کی صورتحال سے متعلق پوچھے گئے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ قدیم عربی ادب اور اب ایک جدید لہر اس میں آئی ہوئی ہے۔ جدید شاعری میں فلسطین بہت چھایا ہوا ہے۔ عرب

کے جتنے اچھے اور معروف شاعر ہیں، وہ سب فلسطین سے ہیں۔ اسی وجہ سے ادب میں مزاحمتی رویہ حاوی ہے۔ نئی نسل یورپین ٹرینڈ سے بہت متاثر ہے۔ شاعروں کا خاص ٹرینڈ نہیں ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر البتہ علمی وادبی سیمینار ہوتے ہیں۔ اور وہاں شعر کی داد تالی بجا کر دی جاتی ہے۔ ایک بات میں نے محسوس کی کہ وہ اپنے شاعروں اور ادیبوں کو بہت احترام دیتے ہیں۔ محمود درویش کو جس شان سے دفنایا گیا، وہ قابلِ رشک تھا۔

البتہ دقیانوسیت بہت ہے۔ ملوکیت کے حوالے سے لوگ بہت رجعت پسند ہیں۔ بادشاہ کے خلاف کچھ بولنا ہی نہیں چاہتے۔

تہوار بہت شوق سے مناتے ہیں۔ میلے ان کی روایت میں شامل ہیں۔ رقص ان کا ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاں بلوچی چاپ۔ البتہ وہاں روایتی رقص معاشرتی تربیت کا حصہ ہے۔ بچے سے لے کر معزز شہری تک رقص کرتے ہیں۔

جہاں تک وہاں آباد بلوچ قبائل کا تعلق ہے تو اس میں جھالاوان کے لوگ بھی ہیں لیکن زیادہ تر وہ بلوچ قبائل ہیں جو سندھ سے گئے ہوئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عرب جانے کے لیے قدیم زمینی راستہ یہی ہوا کرتا تھا۔ لوگ کمانے گئے، حج کیا پھر زیادہ تر وہیں آباد ہوگئے۔ کل چھ ہزار کے قریب پاکستانی ہیں۔ چار ہزار کے لگ بھگ بلوچ قبائل ہیں جن میں اکثریت سندھ کی ہے۔ البتہ انہیں نیشنلٹی نہیں ملتی۔ ایک مخصوص اقامہ دی جاتی ہے جس کی ہر سال تجدید کروانی ہوگی ہے۔ ان قبائل کے پاس حالانکہ پیسے بہت ہیں لیکن نہ گھر ہے نہ نیشنلٹی ہے نہ تعلیم، پاسپورٹ، شناختی کارڈ مکمل کاغذات واندراج پاکستان ہے عرب ممالک آنے جانے کے لیے کوئی ویزہ ضروری نہیں ایک کارڈ ہے جس پر ایک ماہ کے لیے آجا سکتے ہیں۔

اکتوبر:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی ماہانہ فکری نشست **سنگت پوہ وزانت**، 25 اکتوبر 2009 کی شام منعقد ہوئی۔ نشست کی صدارت جہاں آرا تبسم نے کی جبکہ حسبِ روایت تخلیق کاروں کے نام پوشیدہ رکھے گئے اور تنقید کے لیے پیش کیا جانے والا افسانہ بعنوان'' کہانی سے نکلے ہوئے کردار'' پوہ وزانت کے انچارج علی کمیل قزلباش نے پڑھ کر سنایا۔

اس افسانہ پر مفصل بحث کی گئی اور تبصرے مکمل ہونے کے بعد بتایا گیا کہ مذکورہ افسانہ عابد میر کا تھا۔

علاوہ ازیں اکیڈمی کے ڈپٹی سیکرٹری ڈاکٹر سعید مستوئی کی صحت یابی کے لیے دعا کی گئی۔

نومبر:

ڈاکٹر سعید مستوئی زندگی بھر بالا دست طبقوں کے استحصالی نظام کے خلاف نبرد آزما رہنے کے ساتھ ساتھ مختلف بیماریوں کے خلاف بھی مزاحمت کرتا رہا اور بالآخر 15 نومبر 2009 کو کراچی کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گیا۔

ڈاکٹر سعید مستوئی سنگت اکیڈمی آف سائنسز کا ڈپٹی جنرل سیکرٹری تھا۔ اس کی یاد میں ایک تعزیتی ریفرنس اکادمی ادبیات پاکستان کے ہال میں زیرِ صدارت وحید زہیر منعقد ہوا۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری نے کہا کہ ڈاکٹر سعید مستوئی کے خاندانی پس منظر کے بارے میں آج تک ہم نے اُس سے پوچھا نہیں۔ نہ ہی وہ اپنے بارے میں زیادہ بتاتا تھا۔ ڈاکٹر سعید مستوئی زمانہ طالب علمی سے لے کر سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے قیام تک ہمیشہ متحرک رہا۔ سوشلزم کے عہد کے اباؤٹ ٹرن کرنے کے بعد سرمایہ داری کا عہد شروع ہوا، نفسانفسی کے اس عالم میں بہت سے نظریاتی ساتھی غیر فعال رہے یا پھر سرمایہ دارانہ نظام کے سانچے میں ڈھل گئے۔ لیکن ڈاکٹر سعید مستوئی مایوس نہیں ہوا۔ وہ متحرک رہا۔ بزنجو فاؤنڈیشن کے قیام میں پیش پیش رہا۔ ایسے انسان غیر معمولی انسان ہوتے ہیں۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور سادہ مزاج انسان تھا۔ وہ خرابی صحت کے باوجود سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی ادبی اور انتظامی نشستوں میں پیش پیش تھا۔

وحید زہیر نے کہا کہ ڈاکٹر سعید مستوئی کے بے وقت انتقال پر افسوس رہا۔ وہ ایک سچا انسان تھا۔ وہ سنگت اکیڈمی کے متحرک ساتھیوں میں سے تھا۔ ترقی پسند فکر کے حوالے سے ہونے والی تقاریب میں وہ ضرور شرکت کرتا۔ وحید زہیر نے معروف ڈرامہ نگار ظفر معراج کا بھیجا ہوا ڈاکٹر سعید کی یاد میں مقالہ پڑھ کر سنایا۔

کامریڈ کلیم نے کہا کہ ڈاکٹر سعید مستوئی کی شخصیت میں مزاح کا ایک پہلو بھی تھا جہاں بیٹھتا دوستوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا اور سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ

لیتا۔ محترمہ تسنیم صنم نے کہا کہ گو کہ سنگت اکیڈمی کی نشستوں میں اس کا اظہار خیال سن کر احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم انسان ہے۔ عرفان الحق صائم نے کہا کہ وہ ایک بہترین انسان اور اچھا ساتھی تھا۔ سرور آغا نے کہا کہ ڈاکٹر سعید مستوئی سنگت اکیڈمی کے پروگراموں میں سنجیدگی سے شرکت کرتا۔ ڈاکٹر منیر رئیسانی نے ڈاکٹر سعید مستوئی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ پیشے کے اعتبار سے میرا ہم پیشہ تھا۔ اور ایک اچھا دانشور بھی تھا۔ عابد میر نے کہا کہ ڈاکٹر سعید مستوئی ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن کے رہنماؤں سے تھا۔ وہ بالا دست طبقوں، جاگیردارانہ سسٹم، فرسودہ قبائلی نظام کے خلاف ہمیشہ متحرک رہا۔ وہ ایک اچھا دانشور، لکھاری اور شاعر تھا۔

آخر میں ڈاکٹر سعید مستوئی، نجمہ واحد اور عالیہ اسما کی مغفرت کے لیے دعا کی گئی۔

دسمبر:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی ماہانہ فکری نشست **پوہ و زانت** کا انعقاد کیا گیا۔

پوہ و زانت کے انچارج ڈاکٹر علی کمیل نے بتایا کہ ایک افسانہ اور نظم تنقید کے لیے پیش کیے جائیں گے جن کے تخلیق کاروں کا نام آخر میں بتایا جائے گا۔ پوہ وزانت کی صدارت محترمہ تسنیم صنم نے کی۔ علی کمیل قزلباش نے ''کالی کا سنہرا دِل'' کے عنوان سے افسانہ پڑھ کر سنایا۔

افسانے پر بھرپور تبصروں کے بعد علی کمیل نے حاضرین کو بتایا کہ پیش کیا گیا افسانہ محترمہ تسنیم صنم کا تھا جنہوں نے صدرِ مجلس ہونے کے باوجود خندہ پیشانی سے تنقید کو سُنا۔

پوہ و زانت کے دوسرے حصے میں ایک غزل تنقید کے لیے پیش کی گئی۔ علی کمیل نے غزل پڑھ کر سنائی۔

ایک ایک شعر پر بحث ہوئی، بخیہ بخیہ، لفظ لفظ پہ خیال آرائی ہوئی۔

بعد ازاں علی کمیل نے بتایا کہ مذکورہ غزل ڈاکٹر منیر رئیسانی کی تھی۔ جنہیں بھرپور داد دی گئی اور کلامِ شاعر، بزبانِ شاعر سننے کی فرمائش بھی کی گئی۔

آخر میں معروف نوجوان بلوچ فنکار سرمد کچکی کی ناگہانی وفات پر تعزیتی قرارداد جبکہ پریس کلب پشاور پہ ہونے والے حملے کے خلاف مذمتی قرارداد منظور کی گئی۔

سال2010

مارچ:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز نے ممتاز سکالرڈاکٹر انوار احمد کے ساتھ ایک نشست رکھی۔اس نشست میں ڈاکٹر انوار کے لیکچر کا اہتمام کیا گیا تھا جس کا عنوان تھا؛ جاپان میں ناول نگاری۔

ڈاکٹر انوار احمد نے اپنے لیکچر میں کہا کہ ''میں نے 4 مئی 1971 میں ڈگری کالج کوئٹہ سے پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا جو تا حال جاری ہے۔آج کل میں اوساکا یونیورسٹی آف لینگو جز ریسرچ سینٹر میں درس دیتا ہوں۔1995 سے 1999 تک انقرہ یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا۔ترکی زبان و کلچر ہم سے غیر مانوس نہ تھا جبکہ جاپان تو بالکل اجنبی سا معلوم ہوا۔اب ان کے الفاظ دیکھیں آہو کے معنی ہیں اُلو کا پٹھا۔کراچی کا ناظم اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں فقط آہو ہی کہتا تو کام چل جاتا۔جاچی کے معنی گھٹیا یا نیچ اور ماں کے لیے ہاہا کہا جاتا ہے اور وہاں پہ سر کہنے پر خوش نہ ہو یئے گا،سر وہاں پر بندر کو کہتے ہیں۔ ترک ادب سے واقفیت کی بنا پر میں ان سے مضمون بناتا تھا۔زبان پڑھانے والوں کو الف سے آم، ب سے بکری پڑھانا صحیح نہیں ۔ انہیں ایسی چیزیں پڑھائیں جو ہمارے اور ان کے معاشرے میں مشترک ہوں۔مشعل فاؤنڈیشن نامی ادارے نے جاپانی ناولوں کے تراجم چھاپے جیسے'' کالی بارش''،''ایٹم بم کے بعد کی صورت حال پہ لکھا گیا ہے۔پھر میں نے وہ تراجم پڑھے۔میں اردو اور سرائیکی اور دوسری زبانوں میں تراجم ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں،اور لکھا بھی جس طرح ''ایک صدی کا قصہ'' ۔جاپان کے تین ناول نگاروں کو نوبل انعام مل چکا ہے۔وہاں پڑھنے پڑھانے کا کام بہت زیادہ ہے اور آج کل لوگ موبائل اور نیٹ کے ذریعے کتابیں پڑھتے ہیں۔میں نے ان کے اردو ناول پڑھے ہیں ترجمہ شدہ،جن میں کچھ چیزیں مجھے نظر آئیں۔جیسے وہ نیچر کو اپنا دوست سمجھتے ہیں،اسے اپنا پالن ہار اور معلم گردانتے ہیں۔وہ فطرت سے باتیں کرتے ہیں،ان کی باتیں سمجھتے ہیں۔کچھ ایسے ہیں جو فطرت کے ساتھ لڑتے ہیں۔مندروں وغیرہ میں جب پودا لگاتے ہیں تو اس کے ساتھ محنت اور لگن سے کام کرتے ہیں اور پھر دونسلوں کی کوششوں سے درختوں کو مختلف شکلوں میں ڈھالا جاتا ہے۔یہ عجیب ہے کہ جو یہ جلال و جمال ہے فطرت ان کی دمساز و معلم ہے۔وہ فطرت کو ایک خاص طریقے سے لے کر

چلتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ ہم فطرت کے بیٹے ہیں اور ہم اس سے لاڈ کرتے ہیں اور قدرتی آفات، زلزلہ وغیرہ کو وہ ماں کی ناراضی گردانتے ہیں جب کوئی معاشرہ اس طرح ہو تو وہ اپنے بچوں کو کتنا چاہتا ہوگا۔

''انہوں نے بچوں کے بارے میں بہت سے ناول لکھے جو بہت خوبصورت ہیں۔جنگ عظیم کے دوران پھر اس کے بعد ان کا سب سے بڑا سمبل بچے تھے۔میں ہیروشیما کے میوزیم گیا تو وہاں دیکھا کہ ان کا سب سے بڑا کردار جو ماؤں کے بین کے درمیان تھا؛یعنی جلے ہوئے بستے، جلے ہوئے جوتے وغیرہ جنہیں دیکھ کر ماؤں نے اپنے بچوں کی پہچان کی ہوگی اور میوزیم کے آخر میں ایک سبز پتہ اور اس پتے کے نیچے لکھتا تھا کہ 75 برس تک کوئی سبزہ نہ اُگا اور 75 سال کے بعد یہ پہلا پتہ ہے کہ جس نے ہمیں فطرت کا یہ پیغام دیا کہ وہ ہمیں دلاسہ دے رہی ہے کہ آگے بڑھو۔

ان کے ناولوں میں ایک اور اہم بات وہ نسل ہے،جس نے ایٹم بم کی تباہ کاریاں دیکھیں۔ جس طرح ایک لڑکی جس پر ایٹمی تباہ کاریوں کے اثرات ہیں اور اس کا محبوب اور اس کے گھر والے اسے اپنانے سے انکاری ہیں جبکہ لڑکی والوں کی یہ کوشش ہے کہ وہ ثابت کردیں کہ یہ ایٹمی اثرات سے محفوظ رہی ہے۔

ایٹم بم کے بعد سب سے بڑا دھما کا جاپان کے شہنشاہ کا قوم سے خطاب تھا۔وہ شہنشاہ جسے قوم ناقابل تسخیر سمجھتی تھی اور اسے خدا کا اوتار گردانتی تھی۔اس نے کہا کہ میں ایک انسان ہوں اور ہمیں شکست ہوئی ہے۔فطرت نے انہیں درس دیا کہ جوڈو کراٹے سے ٹینکوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔وہاں کے ناول جنگی حالات بھی بتاتے ہیں کہ غریبوں کے پاس کھانے کو ایک نوالہ نہیں جبکہ افسروں کے گھروں سے مچھلی اور چاول کے پکنے کی خوشبو آتی تھی۔زیادہ تر وہاں خواتین نے لکھا۔وہاں مواقع آئے جب نظام بدلا تو جو نیا آتا وہ پرانے کو غلط اور غدار بتاتا اور خود کو نیک اور پارسا مگر لکھنے والوں نے لکھا کہ طاقتوروں کے فرمان سے نظام نہیں بدل سکتا اور ایک فرمان سے ماضی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ فطرت سے اتنے قریب تر تھے کہ وہ دریا، پانی، پرندوں کی آوازیں سنتے، سمجھتے، درختوں سے ہم کلام ہوتے، بانس کے جنگلات سے باتیں کرتے۔ان کا مذہب شنتو ہے جو ان کی سہولیات کے حساب سے ان کے رسم و رواج میں تبدیلی کرتا ہے۔

50 سال سے اوپر کی عمر والے شنتومت کو مانتے ہیں مگر آج کل کے نوجوان اپنے مذہب میں اتنے جوشیلے نہیں۔ اسی وجہ سے عیسائی اور مسلمان مبلغ کثیر تعداد میں وہاں موجود ہیں۔ جاپانی ناول ''24 آنکھیں'' جس کا ترجمہ پڑھا تو حیرت ہوئی کہ لکھنے والی کوئی ادیب یا مصنفہ نہیں بلکہ ایک ڈاکخانے کی ملازم ہے۔ میں اس ناول کو پڑھ کر کئی دفعہ رویا۔ اس ناول میں ایک ٹیچر ہے۔ اس کے علاوہ ایک فوجی پلٹون جو گاتی بجاتی رہتی ہے۔ جنگل میں بھی وہ بانس اور درختوں سے ڈھول بناتے بانسری بجاتے رہتے اور جنگ کے بعد جب وہ واپس آتے ہیں تو اپنا ایک ساتھی گم کر آتے ہیں، وہ خود ان سے دور بچھڑا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے مذہب میں جب تک کسی مردے کی صحیح تدفین نہ کی جائے اس کی روح بھٹکتی رہتی ہے۔ وہ جنگل میں ہڈیاں جمع کرتا ہے اور انہیں دفناتا ہے اور وہ ایک طوطے کو سکھاتا ہے اور طوطے کے ذریعے اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔ طوطا لوگوں کو آکر بتاتا ہے کہ وہ نہیں آسکتا۔

وحید ظہیر نے سوال پوچھا کہ جاپانی اپنی زبان سے محبت رکھتے ہیں آخر کیوں؟۔

ڈاکٹر انوار احمد نے کہا جاپان کے موبائل صرف جاپانی میں ہیں۔ ایک لکھنے والوں کا گروپ ایسا ہے جو باہر چلے گئے اور وہ انگریزی میں لکھنے لگے۔ جاپانی انہیں اپنا ملکی باشندہ نہیں مانتے۔ جاپان میں ڈاکٹرز بھی جاپانی میں بولتے ہیں اور اس طرح اگر آپ اپنی زبان بولتے ہیں تو آپ کو دوسری زبانوں سے ادب کو ترجمہ کرنا ہوگا۔ ہم تو بچوں کو سہولیات نہیں دیتے اور جاپانیوں کے مذہب تک میں چائے بنانا، پھول بنانا وغیرہ کا درس دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو مجھے یاد ہے کہ ایک استاد کلاس میں سویا ہوا تھا اور بچے شور کر رہے تھے۔ استاد جاگا اور بولا چپ کرو گے یا پڑھاؤں؟۔ جاپان میں کلاس میں تو پڑھاتے ہیں، جب آدھی چھٹی ہوتی ہے تب بھی ایک استاد ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سب سے بہتر مستقبل ہمارے بچے ہیں اور سوسائٹی بچوں پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔

جاپان کے مذہبی رویوں کے بارے میں سوال کے جواب میں ڈاکٹر انوار احمد نے کہا کہ ان میں جو مذہبی طبقہ ہے وہ پیسے بٹورتا ہے اور لکھا ہوتا ہے کہ وہ خصوصی دعا کے لیے اتنے روپے، فلاں مراد مانگنے کا اتنا خرچہ وغیرہ۔ بعض لوگ مرجانے والے بڑے بوڑھوں کے لیے نام خریدتے ہیں، پاکیزہ نام۔ شہنشاہ کی پرستش جنت کے لیے واجب ہے۔ مندر ہر قسم کے ٹیکسوں سے مستثنیٰ ہیں۔

مئی:

سنگت پوہ زانت کی ماہانہ ادبی میٹنگ منعقد ہوئی۔ اس دفعہ میر یوسف عزیز مگسی کی یاد میں ڈاکٹر شاہ محمد مری کا مضمون رکھا گیا تھا۔ تقریب کا آغاز ڈاکٹر منیر رئیسانی کے ابتدائی کلمات سے ہوا۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری نے کہا،'' یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم فقط ظالموں کو جانتے ہیں کہ جیسے ہم سکندر اعظم کو جانتے ہیں، ہلاکو اور چنگیز کو جانتے ہیں یعنی شیطانوں کو جانتے ہیں۔ حکمران بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور ہمارا بلوچ معاشرہ بھی اسی طرح ہے۔ جبکہ اگر دیکھا جائے تو یوسف عزیز مگسی نے بلوچ قومی تحریک کو ایک مقام تک پہنچایا۔ آپ نے بلوچ قوم کو 14 نکات دیے۔

1- یوسف عزیز مگسی نے بلوچ قوم کو باہم ملا دیا اور لفظ بلوچ استعمال کیا۔

2- پہلی بار سیاسی پارٹی قائم کی۔

3- سیاسی پارٹی قبیلے کی بنیاد پر قائم نہ تھی بلکہ ورکر پارٹی قائم کی اور خونی رشتوں کی بجائے شعور کے رشتے قائم کیے۔

4- پہلی بار شعوری انداز میں سرداروں اور سرداریت کے خلاف بات کی۔

5- پہلی بار بلوچ تحریک میں تلوار کیساتھ ساتھ قلم بھی استعمال ہوا۔ اخبار، پریس کا اجرا کیا۔

6- بڑی مشکل سے پرخلوص دوست تلاش کیے جنہوں نے ان کی تحریک کو آگے بڑھایا۔

7- وہ پہلے سیاسی قیدی تھے جنہیں قلم وکاغذ کی وجہ سے 14 ماہ قید اور 10 ہزار جرمانہ لگا۔

8- پہلی بار پورے متحدہ ہندوستان کے بلوچوں کی دو بڑی کانفرنسیں جیکب آباد اور حیدرآباد میں منعقد کروائیں اور مختلف قراردادیں پیش کیں۔

9- پڑوسی قوموں کے اندر اتحادی ڈھونڈے۔

10- لوگوں کو شعور دیا۔ آزادی کے بارے میں انہیں آگاہ کیا اور آبادی میں تعلیم کو بنیادی جزو قرار دیا۔

11- پہلی بار مگسی ایجیٹیشن کے نام پر پورے قبیلے نے ہجرت کی اور وطن سے دور نکل کر وطن کے لیے کوشش کی۔

12- چھوٹے پیمانے پر انقلابی حکومت قائم کی۔ شراب اور جوا بند کیا گیا۔ یونیورسٹی کھولی، نہر بنائی، نئے شہر کی بنیاد رکھی۔

13- جاگیرداروں سے زمین چھین کر غریبوں میں تقسیم کرنے کی بات کی۔ مزدوروں کی یونین بنائی، سوشلزم کے حق میں مضمون لکھے اور سوشلسٹ نظام کی تعریف کی۔

14- عورتوں کی حمایت میں بہت کچھ لکھا۔ آپ کی عورتوں کے حوالے سے دو باتیں بہت اہم ہیں۔

-الف: آزادی کا حصول بلوچ خواتین کے بغیر ممکن نہیں۔

-ب: ایک دن آئے گا کہ بلوچ قوم کو عورت کا حق دینا ہوگا۔

بتایا گیا کہ اس کا سیاسی منشور تھا۔1932 کی قراردادیں کہ لڑکیوں کو بیچنا جائز نہیں۔ بیوہ عورت سے پوچھا جائے کہ وہ شادی کرے گی یا نہیں۔ مارکیٹ تک کی چیزوں کی قیمتوں کا تعین کیا۔ بڑا آدمی تھا، اسے محدود کرنا غلط ہوگا۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ اس نے بلوچوں کو فوکس کیا۔ بارہ سے تیرہ سال کی بھرپور زندگی گزاری۔

سرور آغا: لندن جانے کے بعد وہ جدت پسند ہو گیا یا نہیں؟

ڈاکٹر شاہ محمد مری: بے شک لندن جانے کے بعد نئے خیالات ذہن میں ابھرے۔ میر صاحب نے امین کھوسو کو خط لکھا جو اس کی روشن فکری کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اس کا یہ خط آپ کے فکر و سوچ کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ہر شخص کو یہ خط پڑھنا چاہیے۔

تسنیم صنم: میر صاحب نے 14 نکات پیش کئے مگر یہ سب معاشرے میں کیوں لاگو نہ ہو سکا؟۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری: اسے بدقسمتی کہیں کہ ہمارے ہاں ابھی تک کوئی بڑا آدمی اپنے بعد کوئی تحریک باقی نہ رکھ سکا یعنی اس کے بعد کوئی تحریک نہ بن سکی۔ جیسے کرد، امین کھوسو، عبدالصمد اچکزئی، غوث بخش بزنجو، گل خان نصیر، کسی بھی بڑے آدمی کے بعد اس کی کوئی تحریک سامنے نہیں آتی۔

جون:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی ایگزیکٹو باڈی کا اجلاس 13 جون کی شام اکیڈمی کے دفتر مری لیب فاطمہ جناح روڈ کوئٹہ میں منعقد ہوا۔

شرکا نے ایجنڈے پر موجود تمام نقاط پر تفصیلی بات چیت کی۔

ممبران کی فیس ریکارڈ کے ضمن میں صدر وحید زہیر نے تفصیل سے بتایا۔

آئندہ پوہ زانت 26 جون بروز ہفتہ پروفیسر اکرم دوست کے ساتھ ان کی آرٹ گیلری میں منعقد کی جائے گی۔

صدر وحید زہیر نے بتایا کہ سنگت اکیڈمی کے ڈپٹی سیکریٹری سنگت ڈاکٹر سعید مستوئی کی گزشتہ برس رحلت کے باعث یہ عہدہ خالی تھا جس کے لیے اب کسی اور دوست کو اس عہدے کے لیے ذمہ داریاں تفویض کرنی چاہئیں۔ اس ضمن میں اتفاق رائے سے اکیڈمی کے فعال ممبر بلوچی زبان کے شاعر اور استاد سنگت رفیق کا نام تجویز کیا گیا۔ اسی طرح بعض ایگزیکٹو ممبران کی غیر موجودگی کے باعث انہیں تبدیل کرتے ہوئے ان کی جگہ جویریہ خان اور یعقوب شاہ غرشین کے نام تجویز کیے گئے۔

صدر نے شرکا کو بتایا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جناب راحت سعید نے اکیڈمی کے سینئر ممبر ڈاکٹر شاہ محمد مری سے رابطہ کیا کہ ادبیات کے تعاون سے آئندہ برس فیض کے صد سالہ جشن کی تقریبات ہوں گی۔ بلوچستان میں تقریبات میں تعاون کے حوالے سے وہ ہم سے تعاون چاہتے ہیں لیکن یہ مجھے بھی علم نہیں کہ اس تعاون کی سطح کیا ہوگی کہ تقریبات وہ کریں گے اور ہم صرف انتظامات کریں یا دونوں تنظیمیں مل کر کوئی تقریب کریں گی۔

عابد میر نے کہا کہ ہم ترقی پسند تحریک کے فکری اتحادی تو ضرور ہیں اور فیض کو اپنے فکری قافلے کا دوست بھی سمجھتے ہیں لیکن ہماری اپنی ایک جدا تنظیمی شناخت ہے اس لیے انجمن اگر ہمارے توسط سے بلوچستان میں کوئی سرگرمی کرنا چاہتی ہے تو انہیں واضح کرنا ہوگا کہ یہ ترقی پسند مصنفین کی جانب سے **سنگت** کی سرگرمی ہوگی یا کہ **سنگت** کے ساتھیوں کے زور پر انجمن کی سرگرمی۔ اس لیے یہ وضاحت ضروری ہے کہ وہ ہم سے کیا توقع رکھتے ہیں، تبھی ہم انہیں کوئی جواب بھجوا سکتے ہیں۔

بعد ازاں شرکا کی جانب سے یہ طے پایا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے بلوچستان میں فیض سے متعلق ہونے والی تقریبات کا تفصیلی شیڈول موصول ہونے کے بعد اسے جنرل باڈی میں بحث کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اور وہیں تمام دوستوں کی متفقہ رائے کے بعد حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔

جولائی:

(1)

سنگت پوہ وزانت کی ماہانہ فکری نشست 4 جولائی 2010 کو منعقد ہوئی۔ جس میں حسب

پروگرام پروفیسر شفیع آغا نے منطق پر لیکچر دیا۔نشست میں سنگت کے ممبران کے علاوہ یونیورسٹی کے طلبہ اورنوجوانوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ پشاور سے تشریف لانے والے معروف ادیب سلیم راز کو مہمانِ خصوصی کی نشست دی گئی۔صدارت اکیڈمی کے صدر وحید زہیر نے کی۔

سنگت اکیڈمی کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر منیر رئیسانی نے اکیڈمی کے مختصر تعارف کے علاوہ تمام مہمانوں کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔بعدازاں **سنگت پوہ وزانت** کے انچارج ڈاکٹر علی کمیل قزلباش نے اس فکری سلسلے کا تعارف پیش کیا اور بتایا کہ سنگت اکیڈمی کے زیراہتمام **پوہ وزانت** کی نشستیں کئی برس سے تسلسل کے ساتھ منعقد ہورہی ہیں جس میں ہم مختلف دوستوں کی تخلیقات پر تنقیدی مباحث کے علاوہ مختلف اسکالرز کے لیکچرز کا خصوصی اہتمام بھی کرتے رہتے ہیں۔اسی سلسلے میں آج فلسفے کے استاد پروفیسر شفیع آغا کو ہم نے زحمت دی ہے۔شفیع آغا بلوچستان میں فلسفے کا ایک بڑا نام ہے جس کے کام سے استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی جتنا کہ اس کی ضرورت ہے۔

پروفیسر شفیع آغا نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ہاں اکثر لوگ منطقی بات تو کرتے ہیں لیکن منطق پر بات نہیں کرتے۔اس کی مثال میں یہ دیتا ہوں کہ فٹ بالر میسی کو اس وقت دنیا کا سب سے فِٹ آدمی کہا جاتا ہے۔اوراس کے گردے سب سے زیادہ فٹ اور فعال ہیں، حالانکہ عین ممکن ہے کہ گردوں کے فنکشن کے اسپیشلسٹ ادیب رضوی کے گردے فٹ نہ ہوں جو گردوں کے تمام فنکشن کو جانتا اور سمجھتا ہے۔منطقی بات کرنے والے دوست میسی جیسے ہیں جو گردوں کا فنکشن نہیں جانتے لیکن فٹ ہیں۔

منطق کیسے کام کرتی ہے، اس کی ایک ذاتی مثال میں یوں دیتا ہوں کہ ہمارے ایک مولانا لیڈر نے ہمارے گاؤں میں ہونے والے ایک جلسے میں کہا کہ کون کہتا ہے کہ ملا سیاست نہیں جانتا۔ پھر اس نے حاضرین سے پوچھا سیاست کس زبان کا لفظ ہے؟ سب نے کہا عربی۔تو اس نے پوچھا عربی سب سے زیادہ کون جانتا ہے؟ سب نے کہا کہ مولوی۔تو اس نے دلیل دی تو پھر سیاست کو مولوی زیادہ جانتا ہے یا سیاست دان؟ سب بولے مولوی۔

اب لوگ اس دلیل پر عش عش کر اُٹھے۔میرے والد صاحب ساتھ تھے۔واپسی پر بولے واقعی دلیل تو مولانا نے زبردست دی ہے۔میں نے عرض کیا کہ اس کی یہ دلیل خود ان کے ہاتھوں ہی ردّ

ہوسکتی ہے۔اس نے پہلے سے طے شدہ معلومات کی بنیاد پر نتیجہ اخذ کیا۔منطق کے لحاظ سے اُس سے پوچھا جاسکتا ہے کہ پولیٹکس کس زبان کا لفظ ہے؟ انگریزی کا! اور انگریزی کو ڈاکٹر مولوی سے زیادہ جانتا ہے تو گویا ڈاکٹر مولوی سے زیادہ پولیٹکس کو جانتا ہے۔اسی دلیل کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اس سے پوچھ سکتے ہیں کہ حجامت کس زبان کا لفظ ہے؟ عربی کا! تو گویا حجامت کو نائی سے زیادہ مُلا جانتا ہے۔تو یہ بنیادی کام ہے منطق کا کہ دلیل کا دلیل سے مقابلہ کرنا۔جو دلیل سامنے والا لاتا ہے، اُسے پکڑنا زیادہ آسان ہے کہ وہ اپنی زنجیریں خود ساتھ لاتا ہے۔اُسے اُس میں جکڑنا آپ کا کام ہے۔

ارسطو اوران کے پیش رو سبھی منطقی بات کرتے تھے لیکن منطق نہیں جانتے تھے۔ارسطو نے پہلی بار منطق کا کھوج لگایا۔

کوئی واقعہ ازخود نہیں ہوتا۔اس کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔الف پہلے ہے ب بعد میں۔ یعنی الف سے ب بنا ہے۔قانون Quantitative ہے۔ یہ امپوز ہوا اور ذہنی سطح بن گیا۔اور لوگ اسی مخصوص ذہنی سطح کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔کارل پوپر نے اڈلر کے سامنے ایک بچے کا مسئلہ بیان کیا۔اڈلر نے کہا یہ احساسِ کمتری کا معاملہ ہے۔پوپر نے پوچھا آپ کو کیسے پتہ چلا۔آپ نے نہ بچے کو دیکھا، نہ اس کا مشاہدہ کیا؟ کہا میں ایسے دس ہزار تجربے رکھتا ہوں۔تو پوپر نے کہا تو پھر اب آپ کہیں کہ آپ کے پاس دس ہزار ایک تجربے ہیں حالانکہ وہ ہیں نہیں۔صاف بات ہے کہ آپ نتائج پہلے سے طے کر چکے ہیں، اس لیے بچہ دیکھے بغیر فتویٰ دے دیا۔اب اگر آپ بچہ دیکھ بھی لیں تو بھی آپ یہی ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔

تو یوں کارل پوپر نے فلسفے کو اوراس میں بالخصوص منطق کو ایک نئی جہت دی۔کہ جب آپ نتائج پہلے سے طے کر لیتے ہیں تو پھر بات نہیں ہوسکتی۔تنقیدی فکر رکھیں تو بات ہوسکتی ہے۔

اب جیسے دُعا کی اپنی ایک فلاسفی ہے۔ہم ارادے کی بات کرتے ہیں کہ ارادہ کیا ہے۔میں پانی کا گھونٹ لینے کا ارادہ کرتا ہوں (سامنے رکھے گلاس سے گھونٹ لے کر) اور یہ میں نے لے لیا۔تو یہ طے ہوا کہ میں ارادہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔لیکن اگر میں نے صبح تین نمک کے چمچ لیے ہوتے یہ پانی مجھے گوارا نہ ہوتا۔یعنی میرے ارادے کو تین نمک کے چمچ توڑ دیتے ہیں۔میں روڈ پر چلتے ہوئے رکشے سے بچنے کا ارادہ کرتا ہوں............ کیسے کرسکتا ہوں؟ اگر نہیں کرسکتا تو یعنی میں اپنے معروض کے

تحت ہوں یا پھر میرا ارادہ کسی بڑے کُلی ارادے کا عکس ہے۔ مثلاً میں گرمی میں آگ پہ ہاتھ نہیں تاپ سکتا۔ کوٹ نہیں پہن سکتا۔ اگر پہن بھی لوں تو مزہ نہیں لے سکتا۔ تو میری آزادی کہاں ہے؟ جیسے غصہ، خوشگواری یہ کیفیات میرے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ ایسے ہی تمام ترکیفیتیں میرے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ارادہ آزاد ہے جو مجھ پر تھونپا گیا ہے۔

جیسے کبھی کبھی موبائل سم میں آپ کو میسج رسیو نہیں ہوتا کیونکہ آپ کے اِن باکس کا سپیس فُل ہے۔ ایسے ہی ہمارے ہاں لوگوں نے اپنے سپیس فل کیے ہوئے ہیں۔ کسی کا میسج دوسرے تک نہیں پہنچتا ۔ سب اپنی میموری میں مقید ہیں۔

مِتھ فریم ورک، کارل پوپر نے دریافت کی جس میں ہم ہمہ وقت رہتے ہیں۔ یہ وہ مائنڈ سیٹ ہے جو قانون کی صورت میں ہم پر نافذ کر دیا گیا ہے۔ مثلاً میرے سامنے جو گلاس رکھا ہے اسے دیکھ کر مجھے پشاور یاد آتا ہے، یہ جب ایک مائنڈ سیٹ بن جاتا ہے تو پھر میں آپ سے بھی یہ تقاضا کرتا ہوں کہ گلاس کو دیکھ کر آپ کو بھی پشاور یاد آنا چاہیے اور اگر نہیں آتا تو آپ بے وقوف ہیں کیونکہ یہ مجھے نظر آ رہا ہے تو آپ کو کیوں نظر نہیں آ رہا۔ علم کے حصول کا یہ فائدہ ہے کہ کچھ دیواریں گرتی ہیں، ذہن کا دامن وسیع ہوتا ہے۔ الف کے بعد لازماً ب کا آنا مائنڈ سیٹ ہے۔ میں کہتا ہوں حیرت ہے آپ کو ایسا نظر نہیں آتا، آپ کو میری بات سمجھ نہیں آتی، حالانکہ آپ کی بات بھی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی.......... معاملہ یہ ہے کہ سیاق و سباق سے نتائج طے شدہ ہیں۔ ہزار برس تک یہ سلسلہ چلتا رہے تو پھر ہم دو قومیں بنا دیں گے۔ ایک جس کو گلاس دیکھ کر پشاور یاد آئے، دوسری وہ جس کو نہ آئے............ اور پھر وہ اس پر لڑیں گے۔

تو گزارش یہ ہے کہ اپنی میموری میں تھوڑا سا اسپیس پیدا کریں۔ لچکدار لاجک کے ساتھ رہیں۔ چیزوں کو ''لاک فلاسفی'' کے طور پر نہ لیں۔ میں اپنی بات ایک مثال پر ختم کرتا ہوں کہ ایک بچہ ہے جسے باقی بچے بے وقوف کہتے ہیں۔ اسے آزمانے کے لیے وہ اسے دو سکے دیتے ہیں۔ ایک بڑا سکہ ہے، ایک چھوٹا۔ بڑا سکہ دو روپے کا ہے چھوٹا ایک روپے کا۔ وہ بچہ چھوٹا سکہ اٹھا لیتا ہے۔ تیس دن تک وہ اس کے ساتھ یہی کرتے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔ 30 دن بعد وہ اُس سے کہتے ہیں کہ یہ تم کیا کرتے ہو کہ ہم تمہیں دو سکے دیتے ہیں اور تم بے وقوف کم قیمت چھوٹا سکہ اٹھا لیتے ہو تو اس

بچے نے کہا کہ اگر میں پہلے دن بڑا سکہ اٹھا لیتا تو 30 دن تک یہ سکے مجھے نہ ملتے۔

تو آرٹی فشل لاجک پہلے سے طے شدہ ہے۔ وہ فوری فیصلہ لیتا ہے۔ ہمیں اسی سیال لاجک کے ساتھ رہنا چاہیے۔ غالب نے کہا تھا:

رہی نہ طاقتِ گرفتار اور اگر ہو بھی تو
کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے!

بعد ازاں سوالات کا سلسلہ ہوا۔ جناب ساجد بزدار نے سوال کیا کہ مجموعی طور پر ساری گفتگو عالمانہ تھی لیکن اگر ہم جیسے طالب علموں کے لیے آپ منطق کی کوئی مختصر تعریف کر دیں تو شاید ہمیں سمجھ میں کچھ سہولت ہو۔

شفیع آغا نے کہا کہ یوں سمجھ لیں کہ یہ اُن میتھڈز اور فارمولوں کی سٹڈی ہے جو مغالطہ اور دلیل میں فرق کریں۔ کیونکہ مغالطہ اکثر دلیل کی صورت میں ہی آتا ہے۔

عرفان الحق صائم نے پوچھا کہ اگر ارادہ ذہنی محسوسات کا نتیجہ ہے تو وہ تو تبدیل ہوتی رہتی ہیں پھر تو ہم ایک ہی مخصوص مائنڈ سیٹ کے ساتھ رہیں گے؟

شفیع آغا نے کہا کہ یہ آپ نے میری ہی بات کو آگے بڑھایا ہے کہ جب ارادہ بدلے گا تو مائنڈ سیٹ بھی بدلے گا۔ اور نیا ارادہ بھی اسی مائنڈ سیٹ کے ساتھ ہوگا جو پہلے سے طے شدہ ہے۔

پروفیسر برکت علی نے پوچھا کہ کیا مائنڈ سیٹ بدل سکتا ہے؟

شفیع آغا نے کہا کہ مائنڈ سیٹ نہیں بدلتا؛ جیسے میں دیکھنے کا زاویہ تبدیل کر سکتا ہوں لیکن آنکھیں ہیں تو دیکھتی رہیں گی۔ اسی لیے پوپر اور مارکس نے یہ جانا کہ فلاسفی کا یہ کام ہی نہیں کہ وہ حقیقت کو دریافت کرے۔

دانیال طریر نے کہا کہ پھر تو ہر نیا واقعہ نئے مائنڈ سیٹ کا تقاضا کرتا ہے؟

شفیع آغا نے کہا کہ نہیں وہ مائنڈ سیٹ میں اضافہ تو ضرور کرتا ہے لیکن ترمیم نہیں کرتا۔ جیسے بہت سے پھل گرنے کے تجربات سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ یہ قانون ہو سکتا ہے۔ جب یہ قانون کی شکل میں آیا تو مائنڈ سیٹ بنا، اس سے پہلے یہ انفرادی تجربہ تھا۔ مجرد واقعات جب قانون کی شکل اختیار کرتے ہیں تو وہ مائنڈ سیٹ بنتا ہے۔

پروفیسر برکت علی نے کہا کہ تو پھر میرا سوال یہ ہے کہ دو بچے ہیں جو بھائی ہیں ایک ہی گھر میں اُن کی پرورش ہوتی ہے، ایک ہی ماحول میں تربیت ہے لیکن ردِعمل دونوں کا مختلف ہے۔ تو پھر ارادہ کیا ہے؟۔

شفیع آغا نے کہا کہ یہ دونوں بچے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، خود کو نہیں، تو یہ یکساں ماحول نہیں رہا۔ جیسے سب کے پاس ذہن ہے، ہاتھ ہے لیکن کسی نے ذہن سے کام لیا تو کسی نے ہاتھ سے۔ یہ تو جینیٹک پرابلم ہوا۔ اور پھر ''نہ جاننا'' بھی تو اہم ہے کہ گویا وہ میری طرح سے نہیں جانتا!

اس کے بعد جناب سلیم راز کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔

سلیم راز نے سیاسی صورت حال پر گفت گو کرتے ہوئے کہا کہ جہاں تک خیبر پختونخوا کی صورت حال کی بات ہے۔ میں آپ کو اس کا ایک واقعہ بتاتا ہوں کہ وہاں کے سیاستدانوں کی کیا صورت حال ہے۔ ڈیورنڈ لائن کے خاتمے کے حوالے سے پختونخوا میں تمام سیاسی جماعتوں کا ایک سیمینار ہوا جس میں پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ وہاں ہمارے ایک رہنما لطیف آفریدی جب سٹیج پر آئے تو اپنے مخصوص انداز میں سر پہ ہاتھ رکھ کر بولے میں حیران ہوں کہ ہم کس کو دھوکہ دینے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ یہاں جتنے لوگ بیٹھے ہیں ہر ماہ ہم سب کی ملاقات جی ایچ کیو میں ہوتی ہے اور ہم وہاں سے ہدایات مع ''لفافے'' کے لے کر نکلتے ہیں۔ اکثر ساتھ وہیں پہ چائے پیتے ہیں، یا کبھی دروازے پہ آتے جاتے ملتے ہیں۔ ہم تمام جماعتوں کو الیکشن کے نتائج تک وہیں سے پہلے سے بتائے جاتے ہیں کہ کس کو کتنی نشستیں ملیں گی۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو میرے بعد آنے والا کوئی ایک نمائندہ آ کر اس کی تردید کردے۔ اور آپ حیران ہوں گے کہ کسی نے اس بات کی تردید نہ کی۔

ادیب اپنا کردار ادا کررہے ہیں لیکن اب بھی کچھ لوگ ہیں جو کھل کر بولنا نہیں چاہتے۔ یہاں ابھی کوئٹہ میں ایک سیمینار سے آرہا ہوں۔ ہمارے دوست اور آپ کے ایک بڑے اچھے شاعر نے کہا کہ ادیبوں کی تحریکیں، خاموش تحریکیں ہوتی ہیں۔ میں نے کہا یہاں بلوچوں کے بچے مر رہے ہیں ان کا مسئلہ عالمی رخ اختیار کرگیا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ ہماری خاموش تحریک ہوگی۔ لیکن کوئی اس پہ نہیں بولا۔

آخر میں سنگت اکیڈمی کے صدر وحید زہیر نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا اور بالخصوص مقررین کا جنہوں نے اپنے علم سے ہم سب کو نوازا۔

(2)

سنگت پوہ زانت کی ماہانہ فکری نشست کا اہتمام 25 جولائی 2010 کو سنگت اکیڈمی کی دو ممبران خواتین کے شعری مجموعوں پہ نشست کے اہتمام سے کیا گیا۔ پوہ زانت کی اس نشست کی صدارت پروین ناز نے کی۔ ڈاکٹر منیر رئیسانی نے محترمہ تسنیم صنم کے شعری مجموعہ ''کچھ خواب سرِ مژگاں'' کے حوالے سے مضمون پیش کیا۔

اُس کے بعد جناب عرفان الحق صائم نے جہاں آرا تبسم کے مجموعہ کلام ''اداسی رقص کرتی ہے'' کے حوالے سے ایک تفصیلی مضمون پڑھا۔

صدرِ مجلس پروین ناز اور دوسرے احباب نے بھی اِن دو کتابوں کے حوالے سے اپنی اپنی آرا کا اظہار کیا۔

پوہ زانت کے اختتام کے بعد بعض اہم اور فوری نوعیت کے تنظیمی معاملات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ضمن میں سنگت پہلے بھی یہ طے کرچکے ہیں اور اب اس فیصلے کی توثیق کرتے ہیں کہ **سنگت** ترقی پسند فکر اور منشور کے ساتھ کام کرتا رہے گا، ہمارا اپنا ڈھانچہ اور طریقہ کار ہے، اسے قبول کرتے ہوئے کوئی ہمارے ساتھ جڑنا چاہے تو ہم خوش آمدید کہیں گے لیکن اسے کسی اور نام یا تنظیم میں ضم نہیں کریں گے۔

اگست :

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی جانب سے ماہانہ نشست کا اہتمام بلوچستان کے مایہ ناز آرٹسٹ اکرم دوست کے ساتھ اس کی ذاتی آرٹ گیلری میں کیا گیا۔

یہاں دیواروں پر سجی رنگ برنگی پینٹنگز ایک خوبصورت اور دلفریب منظر پیش کررہی تھیں۔ بلوچستان کی ثقافت کو بھی تصاویر میں ڈھالا گیا تھا۔ اور بڑی ہستیوں کی تصاویر بھی بنائی گئی تھیں جن میں یوسف عزیز مگسی قابلِ ذکر ہے۔ کچھ پینٹنگز ترتیب وار دکھائی گئیں جو ایک کہانی کی صورت بنائی گئی تھیں۔ اس کے بعد پھر وہ گدان کی پتھریلی زمین تو واقعی اصل لگ رہی تھی۔ پہاڑوں کی پینٹنگز سے

اصلیت جھلک رہی تھی اور لگتا تھا کہ ہم واقعی ان کے بیچ موجود ہیں اور خانہ بدوش خواتین ہمارے پاس بکریاں چرا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات کو بھی رنگوں کے ذریعے تصاویر کی صورت میں ڈھالا گیا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ دوسرے آرٹسٹوں کے فن پارے بھی وہاں موجود تھے۔ان سب کے بارے میں اکرم دوست نے تفصیل سے بتایا۔

اس کے بعد آرٹ گیلری کے ساتھ ہی اکرم دوست کے ساتھ نشست ہوئی جس میں آرٹ کے حوالے سے اکرم دوست سے حاضرین نے سوالات کیے۔اکرم کہتا ہے کہ کسی نئی چیز بنانے کے لیے مجھے سوچنا نہیں پڑتا کیونکہ آرٹ تو میرے اندر بسا ہوا ہے۔ مجھے یہ گدان اور کلچر کی پینٹنگز دوسرے نمبر پر لگتی ہے۔اب میری پہلی ترجیح انسانیت ہے۔انسانیت کو دیکھنا ہے۔انسانیت کو سوچنا ہے اور انسانیت کو پینٹ کرنا ہے۔اب میں بحیثیت انسان سوچتا ہوں۔اس فیلڈ میں انسان اپنے آپ کو ملازم نہیں سمجھتا وہ لوگوں کی پرواہ نہیں کرتا خود کو آزاد تصور کرتا ہے۔لیکن معاشرے کی مصیبتوں کو تصویر کی صورت ڈھالنے، اور ان کے دکھ درد سے مبرا نہیں ہوتا۔میں نے کرافٹس کو بھی آرٹ بنا دیا ہے۔ایسے کرافٹس کہ اگر ان پر بنانے والوں کے دستخط ہوتے تو وہ بھی آج آرٹسٹ کہلواتے۔

فائن آرٹس کا ڈپارٹمنٹ بلوچستان میں ترقی پسندی کی طرف مائل ہے اور دوسرے صوبوں سے کافی آگے ہے۔ ہمارے پاس بہت سے Traditions ہیں جیسے مہرگڑھ وغیرہ اور یہ صرف بلوچوں کی نہیں بلکہ یہ سب کی شناخت ہے اور ہمیں مل کر اس کے لیے کام کرنا ہوگا۔اور یہ خوش آئند بات ہے کہ ہمارے پاس شناخت کے لیے ریفرنس موجود ہیں۔

اس ادبی نشست میں لالہ لال بخش رند جو ترقی پسند شاعر و ادیب تھے اور دانیال طریر کے والد پشتو زبان کے بڑے دانشور سعید گوہر کی وفات پر مرحومین کیلیے فاتحہ خوانی کی گئی۔

ستمبر:

(1)

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی جنرل باڈی کا اجلاس اکیڈمی کے صدر وحید زہیر کی زیر صدارت میں اکیڈمی کے آفس مری لیب میں ہوا۔

اجلاس کے آغاز میں صدر وحید زہیر نے اجلاس کے ایجنڈے سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا

کہ جیسا کہ تمام دوستوں کے علم میں ہے کہ پاکستان سمیت بلوچستان میں آنے والے تاریخ کے بدترین سیلاب نے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلائی ہے۔ بلوچستان کا ضلع جعفرآباد بھی اس کی لپیٹ میں آیا ہے جو شدید متاثر ہوا ہے۔کچھ دوست وہاں پر ریلیف کے حوالے سے کام کر رہے ہیں۔ہم نے بھی اسی سلسلے میں یہ اجلاس منعقد کیا ہے کہ سنگت اکیڈمی کے دوست پہلے مرحلے میں فنڈز جمع کریں اور پھر اس کی تقسیم کے حوالے سے لائحہ عمل مرتب کیا جا سکے۔عابد میر اس حوالے سے وہاں کام کر رہا ہے، ہم اس سے جاننا چاہیں گے کہ وہاں کیا کام ہو رہا ہے اور ہم اس سلسلے میں اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔

عابد میر نے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہم چونکہ اس زمین کا حصہ ہیں جہاں یہ سب ہوا ہے اس لیے یہ ذمہ داری محسوس کی کہ اس کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈالا جائے۔ ہمارے پاس کوئی تنظیمی پلیٹ فارم نہ تھا سو انفرادی طور پر ہم نے کچھ عرصہ پہلے 'ڈِی بلوچ' کے نام سے جو پبلی کیشن کا سلسلہ شروع کیا تھا اسی کے زیر اہتمام ہم نے ایک کمپین چلائی لیکن بیرونی طور پر ملنے والے سامان کی رسائی کے لیے کسی رجسٹرڈ ادارے کا ہونا ضروری تھا تو اس لیے ہم نے سنگت کے ہی کچھ دوست جو جعفرآباد میں سوشل سنگت کے نام سے کام کر رہے ہیں، ان کے تعاون سے اس کمپین کو آگے بڑھایا جس کے تحت دو ہفتوں کے دوران ہم نے مختلف اداروں اور افراد سے ایک لاکھ کے قریب نقد رقوم اور ادویات سمیت کھانے پینے کا کافی سامان اکھٹا کر لیا ہے۔امید ہے کہ ہم عید سے ایک دو روز قبل جعفرآباد میں اپنا کیمپ شروع کریں گے جہاں میڈیکل اور ریلیف کا کام ہوگا۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا میرا خیال ہے کہ کھانے پینے اور ریلیف وغیرہ کے کام پر کافی ادارے اب وہاں کام کر رہے ہیں اور یہ معاملہ کوئی ہفتے دو دن کا نہیں ہے، یہ تو اب لمبا چلے گا۔اس لیے میری رائے یہ ہوگی کہ سنگت اکیڈمی کے فنڈز کو فی الحال جمع کر لیا جائے اور اس کے استعمال پر بعد ازاں غور کیا جائے کہ اسے کسی ایسے استعمال میں لایا جائے جو مستقل بنیادوں پر مفید ثابت ہو، کیونکہ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہم پہلی بار اس قسم کا کام کرنے جا رہے ہیں حالانکہ اس سے قبل زیارت کے زلزلے میں ہم نے یہ طے کیا تھا کہ ہمارا کام دانشورانہ سطح کا ہے ہم ریلیف، چندہ اور امداد وغیرہ کے کاموں میں نہیں جا سکیں گے۔اب اس فیصلے کی شکل میں ہم اپنے گزشتہ فیصلے کی تردید کر رہے ہیں۔اس لیے ذرا سوچ سمجھ کر کام کرنا ہوگا۔

افضل مراد نے کہا کہ اس کے علاوہ یہ سوال بھی اٹھے گا کہ ہمارے اردگرد دیگر مسائل بھی موجود ہیں ہم نے ان پر تو کوئی ایکشن نہیں لیا،صرف اس ڈیزاسٹر پر کام کرنے کا کیا مطلب ہے، نیز یہ کہ پھر آئندہ کیا ہم اس قسم کے ہر ڈیزاسٹر پر کام کرنے کو تیار ہوں گے؟۔

پروفیسر برکت علی نے کہا کہ کام کرنے کی ضرورت تو ہے۔صرف اس جواز پر تو کام نہیں روکا جاسکتا کہ کیونکہ پہلے کام نہیں کیا تو اب بھی نہیں کرنا چاہیے۔بڑی تباہی ہوئی ہے،لوگ بڑے پیمانے پر متاثر ہوئے ہیں،طریقہ کار کا تعین کیا جاسکتا ہے لیکن اسے کام نہ کرنے کا جواز نہیں بنایا جانا چاہیے۔

ظفر معراج نے کہا دانشورانہ سرگرمی کو عملی کام سے الگ کیونکر کیا جاسکتا ہے۔ہم سب اس کا حصہ ہیں اس لیے جو ہوسکتا ہے اتنا ضرور کرنا چاہیے۔

بحث کے نتیجے میں اس بات پر اتفاقِ رائے پایا گیا کہ عید کے بعد اس سلسلے میں ایک اور اجلاس منعقد کیا جائے گا اور جو دوست فی الوقت شرکت نہیں کر سکے،ان کو بھی شرکت پر آمادہ کیا جائے گا ۔نیز اس دوران تمام ممبران سے رابطہ کر کے ان سے فنڈ جمع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔اور عید کے بعد ہونے والے اجلاس میں یہ طے کیا جائے گا کہ اس کے استعمال کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے۔

واضح رہے کہ مذکورہ اجلاس میں اٹھائیس ہزار روپے کا فنڈ جمع کیا جاسکا۔

(2)

پروفیسر نادر قمبرانی کی یاد میں سنگت پوہ زانت کی تقریب منعقد ہوئی۔جس نسبت سے پروفیسر ڈاکٹر عبدالرزاق صابر کا لیکچر رکھا گیا تھا۔

پروفیسر عبدالرزاق صابر نے نادر قمبرانی کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نادر قمبرانی کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔

نادر قمبرانی،قمبرانی قبیلے کی ملک خاندان (مستاک زئی) سے تعلق رکھتا تھا۔ والد حاجی صاحب داد،ایک دینی استاد تھا۔یوں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نادر صاحب ایک مولوی گھرانے میں پیدا ہوا اور ابتدائی تعلیم گھر سے ہی حاصل کی۔ابتدائی جوانی کے ایام میں داڑھی رکھی، پگڑی باندھی اور امامت بھی کی۔ وہ خدمت خلق کے جذبے سے سرشار تھا۔اسی بنا پر ابتدا سریاب میں انجمن اتحاد نوجوانان سریاب بنا کر کی اور تعلیم کے اختتام پر روزی روٹی کے لیے سریاب وولن مل میں بطور منشی کام کرنے لگا۔

مزدوروں کی حالت زار اور مل مالکان کے جبر وستم کو دیکھتے ہوئے وہاں مزدوروں کی ایک انجمن قائم کی اور پھر اس انجمن کا ایک اعلیٰ عہدیدار بنا۔پھر مزدوروں کے حقوق کے لیے ہڑتال کی جس کی پاداش میں اسے وہاں سے نکال دیا گیا۔

سکول کے زمانے میں نادر کی ملاقات عبدالرحمٰن سے ہوتی ہے اور وہاں سے پھر چلتے چلتے بتوسط آزاد جمالدینی لٹ خانے میں شامل ہوگیا۔1958 کے ایوب مارشل لا کے ظلم وستم نے نادر کو اندر سے جھنجھوڑ دیا۔وہ کوئٹہ سے اسپلنجی سائیکل پر گیا اور سردار بہادر خان سے ملاقات کی۔ان سیاسی کاموں کی وجہ سے اس کے وارنٹ بھی جاری ہوئے اور پھر وہ اپنے وارنٹ یافتہ ساتھی حاجی عبدالرحمٰن کے ساتھ ٹرک میں افغانستان کے لیے براستہ نوشکی کردگاپ تک پہنچا۔کردگاپ سے شوراوک گیا اور چند دن نظر محمد خان بڑیچ کا مہمان بنا۔وہاں سے قندھار اور پھر کابل اسے مولوی غلام حیدر لے گیا جو پہلے ہی وہاں جلاوطن تھا۔یہاں وہ ریڈیو کابل سے منسلک ہوگیا اور فروٹ مارکیٹ میں منشی کا کام بھی کرنے لگا۔وہ افغانستان سے واپس آیا تو یہاں بھی ریڈیو سے وابستہ ہوگیا اور جب 1974 میں ذوالفقار علی بھٹو نے ایک قانون کے تحت ملک بھر میں زبانوں کی ترقی اور ترویج کے لیے سٹڈی سینٹر بنائے تو بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے ادیب اور عالم کا کورس شروع کروایا جس میں بلوچی کے لیے عبداللہ جان جمالدینی اور براہوی کے لیے نادر قمبرانی صاحب کا انتخاب ہوا۔

نادر نے آخری ایام تک اپنی تراش خراش اور شخصیت کو جاذب نظر رکھا اور جوانی کے ایام میں تو سوٹڈ بوٹڈ تھا۔

نادر نے اپنی زندگی کی پہلی نظم 1958 میں مستونگ کے ایک جلسے میں پڑھی۔1960ء میں مستونگ کے رسالے ''ایلم'' کا سب ایڈیٹر بھی رہا۔براہوی رسم الخط کو عربی سے فارسی یا اردو میں تبدیل کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر جاتا ہے۔

وہ افغانستان طالبعلم کی حیثیت سے گیا تھا اور وہاں جا کر اس کی قائدانہ صلاحیتوں کو چار چاند لگ گئے وہاں سے واپس آکر اس نے منڈی بہاؤالدین جا کر دوسری شادی کی۔

شاعری کی،افسانے اور مضامین لکھے۔وہ ایک فکر اور سوچ رکھنے والا شاعر تھا اور اس نے شاعری میں وطن دوستی کی نئی جہت شروع کی۔وہ براہوئی ادب میں ادب برائے زندگی کا ایک سرخیل

شاعر تھا۔اس کے افسانوں کا موضوع بھی سماجی مسائل اور وطن دوستی ہے۔

نادر کی شاعری کو اس کے گھر والوں نے اس کے افغانستان جانے کے بعد ضائع کر دیا اور اس کی واپسی کے بعد اس نے اپنی بچی کچی شاعری کو سمیٹ کر کتابی صورت دی۔اسے کبھی غصے میں نہیں دیکھا گیا۔اگر کبھی اختلاف رائے ہوتا بھی تو خاموش ہو جاتا۔وہ ایک عہد ساز شخصیت تھا اس کے گھر والوں کے پاس اب بھی اس کی بہت سی تحریریں ہیں اور انہیں بھی کتابی صورت دینے کی ضرورت ہے۔

اس نے گلستان بوستان و پنج کتاب وغیرہ پڑھ رکھی تھیں اور افغانستان بھی رہ آیا تھا، اسی مناسبت سے فارسی سے وابستگی رہی۔

رابعہ خضداری پر مقالہ لکھا اور فارسی ادارہ کی بنیاد رکھی۔بلوچی میں بھی مضامین لکھے۔

نادر قمبرانی نے انجمن فارسی کے نام سے تنظیم بنائی نادر قمبرانی نے اردو میں بھی شاعری کی اور خود فارسی زبان نہ صرف بولتا تھا بلکہ اس زبان میں لیکچر بھی دیتا تھا۔

اکتوبر:

سنگت پوہ و زانت کی ماہانہ نشست 31 اکتوبر 2010ء کی شام بیادِ سعید گوہر منعقد ہوئی۔

نشست کا آغاز، **پوہ و زانت** کے انچارج ڈاکٹر علی کمیل قزلباش نے ابتدائی کلمات سے کیا۔اس نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے **پوہ و زانت** کی روایت کا سرسری تذکرہ کیا اور کہا کہ **پوہ و زانت** میں ہم اکثر بلوچستان و بیرونِ بلوچستان کی علمی و ادبی شخصیات سے متعلق گفتگو کرتے رہتے ہیں، اور ہم سمجھتے ہیں کہ بالخصوص بلوچستان کی ایسی شخصیات کا تذکرہ از حد ضروری ہے جنہوں نے یہاں علم و فکر کی آبیاری کی۔اس ضمن میں گزشتہ ماہ بھی **پوہ و زانت** کا موضوع ایسی ہی ایک شخصیت جناب پروفیسر نادر قمبرانی تھے۔اب جبکہ اردو اور پشتو کا ایک اچھا شاعر جناب سعید گوہر ہم میں نہیں رہا، تو اس کو یاد کرنا بھی ہمارا فریضہ ہے، کہ سنگت ایسے ہی فکری دوستوں کا قافلہ ہے۔

اس کے بعد جناب عمر گل عسکر نے سعید گوہر کی شخصیت اور اس کے پشتو کلام کے حوالے سے اپنا مفصل مقالہ پیش کیا۔اس نے بتایا کہ سعید گوہر زمانہ طالب علمی سے ہی شعر و ادب کی جانب راغب ہو گیا تھا، لورالائی میں جب ادبی تنظیم قائم ہوئی تو وہ اس کا حصہ بنا۔شاعر اور شخص دونوں اعلیٰ

پائے کا تھا۔اس کا پہلا اردو مجموعہ ہی خوب بکا، طے یہ ہوا کہ اس رقم سے ہی اس کا پشتو مجموعہ چھاپیں گے لیکن افسوس کہ یہ ہو نہ سکا۔اس نے کہا کہ غزل سے سعید گوہر کو عشق تھا اور اس حوالے سے وہ اساتذہ کے مقام پر فائز ہوا۔اس کے اشعار فنکارانہ حسن کے علاوہ انسانی زندگی کے پوشیدہ گوشوں تک بھی رسائی کرتے ہیں۔

سعید گوہر نے نظم کی تبدیلی کے لیے نئے تجربے کئے، روایت سے ہٹ کر لکھا۔اس نے فکری جمود کو توڑا۔رسائل و اخبارات میں بھی لکھتا رہا۔پشتو ادبی تنظیموں سے بھی وابستہ رہا۔ پٹہ خزانہ پر اس کی تحقیق نے دھوم مچا دی۔شہرت اور عزت خوب کمائی۔

سرور جاوید نے 'انسانیت کا اثاثہ؛ سعید گوہر' کے عنوان سے اپنا مضمون پیش کیا۔اس نے سعید گوہر کی نجی زندگی کے مسائل اور ان کی استقامت کی داد دی، اس نے کہا کہ سعید گوہر نے ایک بہادر سپاہی کی طرح زندگی سے بھرپور لڑائی لڑی۔اس لڑائی میں اپنی روح تک کو لہولہان کر لیا، لیکن عمر بھر یہ جنگ جاری رکھی۔زندگی نے اس کے نازک وجود کو خوب کچوکے لگائے، اسے درد دیا لیکن وہ بے پرواہ ہو کر آگے بڑھتا چلا گیا......

آشنا رہ جائے گا ، نا آشنا رہ جائے گا
میں چل پڑوں گا ، قافلہ رہ جائے گا

اسے اپنے آپ پہ بھروسہ تھا۔بنا کسی صلے کے اسے اپنا کام سب سے زیادہ عزیز تھا۔اس کی زندگی ایک روشن ستارے کی طرح تھی۔اس نے انسانیت سے بے پناہ محبت کی، ہر انسان سے محبت کی، اس لیے گوہر ساری انسانیت کا سرمایہ ہے۔

آخر میں معروف شاعرہ پروین فنا سید اور سنگت اکیڈمی کے رکن محمد فیصل کے سسر پروفیسر ڈاکٹر طالب حسین اشرف کی وفات پر تعزیتی قرار دادیں پیش کی گئیں۔

نومبر:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی **پوہ و زانت** بیادِ سائیں کمال خان شیرانی منعقد ہوئی۔

اس حوالے سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے **پوہ و زانت** کے انچارج ڈاکٹر علی کمیل قزلباش نے کہا کہ اس میں کبھی 'میں' نہیں دیکھی۔کبھی اس سے کسی کی غیبت نہیں سنی۔ہمیشہ مطالعے میں

غرق ملا۔ عالمی سیاست پہ بے باک گفتگو کرتا تھا۔

سرور آغا نے اپنی گفتگو کا آغاز پشتو کے ایک محاورے سے کیا کہ ''چاہے سو لوگ مر جائیں لیکن ان کا سربراہ نہ مرے'' لیکن موت اندھی، گونگی اور بہری ہوتی ہے اس لیے وہ نہیں دیکھتی کہ سو لوگوں کو اٹھانا ہے یا سو کی رکھوالی کرنے والے کو۔ بہرحال میں یہ سمجھتا ہوں کہ سائیں کو سمجھنے کے لیے ہمیں لٹ خانے کو یاد کرنا ہوگا۔ کیونکہ لٹ خانے کے بغیر سائیں کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ اس کا ابتدائی تربیتی مرکز ہے۔

عابد میر نے کہا کہ سائیں کمال خان کو کتابوں کا شیدائی، ان پر تبصرہ نگاری کا ماہر، کثیر المطالعہ، سچا مارکسسٹ، علم کا رسیا، راہ دکھانے والا، سچا دوست، حقیقی مددگار، بے غرض رہنمائی کرنے والا، آدمی کو انسان بنانے والا، ہر ایک کے کام آنے والا، بے غرض، بے پرواہ، بے تکبر، بے اعتنا، اپنی زمین اور زبان سے جڑا ہوا، پیار کرنے والا مگر بہت ہی مختلف اظہار کرنے والا، شخص پایا۔

فرید کاسی نے کہا کہ سائیں بہت ہی اعلیٰ، مکمل اور سیدھا سادا انسان تھا۔ کہتا تھا کہ میں ایک عام آدمی ہوں، مجھے جو بھی علم ملا ہے ان کتابوں سے ملا ہے۔ اس لیے کتاب سے میں عشق کرتا ہوں۔ ملاؤں کے سخت خلاف تھا۔

ساجد بزدار نے اپنی تحریر میں کہا کہ سائیں کمال خان سے پہلی ملاقات سنڈے پارٹی میں ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات میں احساس ہوا کہ اس شخص کو آسان نہیں لیا جا سکتا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سچے جذبے بے ساختگی اور برجستگی سے جنم لیتے ہیں اور یہ بے ساختہ اور برجستہ پن سائیں پہ ختم تھا۔ میں نے دیکھا کہ یہ شخص اپنی تعریف پہ نہ تو چونک اٹھتا ہے نہ آپے سے باہر ہوتا ہے۔ ان سے ملنے والا ہر آدمی یہی رائے قائم کرتا کہ وہ ایک شفیق اور بڑا انسان تھا۔ اس نے کئی طعنے سہے مگر کبھی برہم نہ ہوا۔ ہمیشہ مطالعے میں غرق رہتا۔ موجودہ ریاستی ڈھانچے سے اسے تبدیلی کی کوئی امید نہ تھی۔

گل زمان مندوخیل نے کہا کہ سائیں ایک ورسٹائل شخصیت تھا۔ وہ ایک قوم دوست ضرور تھا لیکن شاونسٹ ہرگز نہ تھا۔ اردو والوں سے اس کی نہیں بنتی تھی۔ کہتا تھا کہ اس نے ہماری جوانی 'چونکہ، چنانچہ' میں برباد کر دی۔ لاہور کے سوشلسٹوں کے بارے میں بھی اچھی رائے نہیں رکھتا تھا اور انہیں منافق کہتا تھا۔ خیر بخش مری کے نام پر اس کا یک لفظی تبصرہ ہوتا تھا: 'آفرین'۔ محمود خان اچکزئی کو

پشتون قومی تحریک کا آخری چراغ کہتا تھا۔ سرداریت اور ملائیت کا سخت مخالف تھا۔ بہت پڑھا لکھا آدمی تھا۔ مارکس کو سوشل سائنس کا پیغمبر گردانتا تھا۔ کہتا تھا جس نے مارکس کو نہیں پڑھا، وہ سیاست کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ بلوچ سیاست پہ گہری نظر تھی۔ کہتا تھا کہ آج کل بلوچ علاقوں میں تبلیغی حضرات زیادہ آ رہے ہیں، یہ بلوچوں کے ساتھ افغان انقلاب والا حشر نہ کر دیں۔ نواب جوگیزئی اُس کے پاس آیا اور کہا کہ عوامی لیڈر بننے کا کوئی نسخہ بتائیں۔ کہا کہ دیہات کے کسی ایسے آدمی کے گھر جا کر اس کے بستر پہ ایک رات گزارو، جس کے پاس دیا تک نہ ہو، اور رات بھر تمہیں جوؤں سے لڑنا پڑے۔

آخر میں سنگت اکیڈمی کے صدر وحید زہیر نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے یہ اعلان بھی کیا کہ اگر سائیں کمال خان کا علمی ادبی کام ہمیں مل سکے تو ہم سنگت اکیڈمی کی جانب سے اس کی اشاعت کا اہتمام کریں گے۔

سال 2011

جنوری:

صد سالہ جشن فیضؔ کے حوالے سے، 2011 میں **سنگت** کی ہر ماہ کی نشست میں فیض کے حوالے سے ایک لیکچر کا پروگرام ترتیب دیا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی محترم جاوید اختر کا لیکچر تھا جس کا موضوع تھا ''فیض اور سوشلزم''۔

اس کے بعد ایک غزل تنقید کے لیے پیش کی گئی جس کے ہر شعر کا الگ الگ جائزہ لیا گیا۔

آخر بتایا گیا کہ یہ دانیال طریر کی شاعری ہے جس پر خود اس نے سب سے زیادہ تنقید کی۔

مارچ:

اس ماہ کی **پوہ و زانت** کی صدارت پروفیسر نصر اللہ وزیر نے کی۔ اس تقریب میں ''فیض کے براہوی شاعری پر اثرات'' کے حوالے سے سعید کرد نے ایک مقالہ پیش کیا۔

فیضؔ کی نظم ''مرے دل میرے مسافر'' کو براہوی میں افضل مراد نے ''کنا اُست کنا مسافر'' کے نام سے ترجمہ کیا۔

تقریب کے دوسرے مرحلے میں عرفان الحق صائم کی غزل تنقید کے لیے پیش کی گئی۔ جس

پرتمام دوستوں نے بحث کی۔

اپریل:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی ماہانہ فکری نشست پوہ وزانت کا انعقاد 24 اپریل 2011 کو ہوا۔

اکیڈمی کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر منیر رئیسانی نے نشست کا آغاز کرتے ہوئے بتایا کہ جیسا کہ رواں سال فیض صدی کے سلسلے میں سنگت نے بھی اپنی ماہانہ فکری نشست پوہ وزانت میں فیض صاحب اوران کی فکر سے متعلق گفت وشنید کا سلسلہ رکھا ہے، اسی سلسلے میں آج ہمارے پاس دو مضامین ہیں، جن سے ہم استفادہ کریں گے۔ایک سوویت انقلاب کے پشتو ادب پر اثرات کے حوالے سے جناب ڈاکٹر نصر اللہ خان وزیر کا مقالہ اور دوسرا مزدوروں کے عالمی ترانے کے حوالے سے جناب پروفیسر جاوید اختر کا مضمون ہے۔

نشست میں، سنگت کے عابد میر کے جواں سال ماموں اور سنگت کے فکری ساتھی خورشید مستوئی کی ناگہانی وفات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ان کے حق میں دعا کی گئی۔

اگست:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی جانب سے پوہ وزانت کی ماہانہ فکری نشست کے سلسلے میں ماہِ اگست میں رمضان المبارک کی مناسبت سے افطار پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔

افطار سے قبل 'سنگت کی آئیڈیالوجی' کے حوالے سے گفتگو کی گئی۔ پروفیسر جاوید اختر نے موضوع کو سوال کی صورت کچھ یوں رکھا کہ اگر سنگت میں سیاسی اور سماجی حوالے سے مختلف الخیال لوگ ،ایک پلیٹ فارم پر جمع ہیں، تو ان کے مابین اس اتفاق کی قدرِ مشترک کیا ہے؟۔

سنگت اکیڈمی کے صدر وحید زہیر نے کہا کہ سنگت میں کوئی اس طرح کے مختلف الخیال لوگ بھی نہیں ہیں کہ جو مخالف فرقوں میں بٹے ہوئے ہوں، بعض معاملات پر ہماری رائے کہیں مختلف ہوسکتی ہے، لیکن بنیادی طور پر ہم سب ایک روشن خیال تحریک کا حصہ ہیں، ماضی میں بھی رہے ہیں، اور آئندہ بھی رہیں گے۔ گو کہ اب روشن فکری کا منبع، کمیونزم اب اُس صورت میں نہیں رہا، جیسا کہ نَوے کی دہائی سے قبل تھا، ہم میں سے بعض شاید اب اُس کے باقاعدہ پیروکار بھی نہ ہوں، لیکن بہرحال ہم سب ایک

ایسی تحریک کا حصہ ہیں، جو ادب کو سماج کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔

ڈاکٹر منیر رئیسانی کا کہنا تھا کہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث تو اب آؤٹ ڈیٹڈ ہو چکی ہے، کوئی اگر اس سوال پر بحث کرتا ہے تو وہ گویا پچاس کی دہائی میں زندہ ہے۔اب تو یہ طے ہے کہ ادب میں کوئی ایسا موضوع نہیں جو زندگی سے باہر ہو۔ایک فلمی گیت کو سن کر بھی اگر ہم ذرا سی دیر کے لیے پرسکون ہو جاتے ہیں تو وہ بھی زندگی ہی کا حصہ ہے۔ پھر ادب کے نئے مباحث اتنے آگے چلے گئے ہیں کہ اب پچاس کی دہائی کے مباحث پر سوال رکھنا ہی بے وقوفی ہوگا۔سنگت یقیناً ادب کو زندگی کے ساتھ جوڑ کر دیکھنے والوں کا اکٹھ ہے، ہم پرانے مباحث میں وقت برباد کرنے بجائے نئے مباحث پیدا کرنے پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ باقی اب اگر کوئی ڈنڈا لے کر سر پر کھڑا ہو جائے کہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی میں سے ضرور کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا، جیسے امتحانات میں ہاں اور نہیں میں سے کسی ایک آپشن میں جواب دینا ہوتا ہے تو ہمارا جواب یقیناً ادب برائے زندگی ہوگا، اور یہی ہمارے اتحاد کی وجہ ہوگی۔

سرور آغا نے کہا کہ سنگت اکیڈمی کے دوستوں کے مابین اتفاق کی ایک ہی وجہ ہے اور مختصر ترین الفاظ میں وہ ہے؛ ''ترقی پسندی''۔ ہم سب اس کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ترقی پسندی ہی وہ راستہ ہے جو ہمارے مسائل کے حل کی جانب ہمیں لے جا سکتا ہے۔ مختلف معاملات پر ہماری رائے مختلف ہوسکتی ہے، لیکن وہ رائے بلاشبہ ترقی پسند ہی ہوگی، ہم میں سے کوئی بھی کسی بھی معاملے کے رجعت پسندانہ حل کو پسند نہیں کرے گا۔اس لیے اس سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ ہم اس پر بحث کریں کہ سنگت نے اپنے قیام کے پندرہ برسوں میں سماج میں کیا دیا ہے، گویا اس کے پندرہ برسوں کا آؤٹ پُٹ کیا ہے، میرے خیال میں یہ زیادہ اہم بحث ہوگی۔

عابد میر نے کہا کہ سنگت کی ترقی پسندی اس کے قیام سے ہی واضح تھی، نہ صرف ترقی پسندی بلکہ ترقی پسندی، بلوچستان کے پس منظر میں۔ کیونکہ ترقی پسندی کو جس طرح ایک مخصوص گروہ تک محدود کر دیا گیا تھا، اسی اجارہ داری سے نکلنے کے لیے ہی تو سنگت کی بنیاد پڑی تھی۔اور سنگت صرف ادبی ترقی پسندی کا ادارہ نہیں بلکہ یہ اکیڈمی آف سائنسز ہے، اس کے آئین میں واضح ہے کہ ہم نہ صرف سوشل سائنسز بلکہ میڈیکل سائنسز میں ہونے والی ترقی پسندانہ تحقیقات، ایجادات اور مباحث کا بھی خیر

مقدم کریں گے۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ اُس وقت بھی دو چیزوں پر ہمارا اتفاق تھا کہ ہم نے اِن میں سے فی الوقت ایک ہی کام کرنا ہے، یا تو عوام میں جائیں یا اپنی جڑوں کو مضبوط بنائیں تا کہ عوام خود اس سے جڑ جائیں۔ اور میرا خیال ہے کہ تب بھی تمام دوستوں نے دوسرے نکتے پر ہی اتفاق کیا تھا۔ اور پندرہ برسوں سے اگر ہم اپنے وجود کو بچائے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم اپنی جڑوں سے الگ نہیں ہوئے، اور وہ بھی شورش بھرے خطے کے ہنگامہ زدہ پندرہ برس، جہاں چیزیں اتنی تیزی سے اتھل پتھل ہوئی ہیں کہ لوگ اب اپنے آپ پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں۔ اس ساری بھیڑ بھاڑ میں ہم نے کسی نعرہ بازی اور لیڈری کے شوق میں آئے بغیر صرف اپنے آپ کو مستحکم رکھا ہے تو یہی اصل کریڈٹ بنتا ہے سنگت کا۔

اس کے بعد چند تازہ کتابوں پر گفتگو کی گئی۔

اس ضمن میں افضل مراد نے، نجم الثاقب کے ناول ''یہاں سے آ گے'' کا تعارف کروایا۔

دوسری کتاب، جناب قاضی فضل الرحمان صاحب کی ہے؛ ''بلوچستان میں سٹیج ڈرامے کی روایت''۔ جناب وحید زہیر نے کتاب کا تعارف کروایا۔

نومبر:

(1)

چوتھے انتخابات

سنگت اکیڈمی کی جنرل باڈی کا اجلاس 23 نومبر بروز اتوار کی شام پروفیشنل اکیڈمی، ڈاکٹر شیر محمد روڈ میں منعقد ہوا۔ جس میں نئی کابینہ کے انتخابات ہوئے۔ نیز پوہ و زانت کی نشست بھی منعقد ہوئی۔ کابینہ کے انتخاب اور اس بابت مفصل اظہار خیال کے بعد پوہ وزانت کا سلسلہ ہوا، جس میں فیصل گوندل نے ایک مضمون پڑھا جبکہ شاہ محمود شکیب اور دانیال طریر نے اپنا کلام پیش کیا۔

فیصل گوندل نے اپنے مضمون ''علامہ اقبال کی نظم 'مسجد قرطبہ' کا ایک مطالعہ'' پڑھا۔

اس کے بعد جناب شاہ محمود شکیب نے فارسی اور بلوچی میں دو نظمیں پیش کیں۔ بلوچی نظم کا

عنوان تھا؛ ''قسم'' جس میں شاعر اپنے محبوب کے تمام خد و خال اور نزاکتوں کی قسم لیتا ہے۔ فارسی نظم حافظ شیرازی کے معروف شعر پہ تضمین کے انداز میں لکھی گئی تھی۔ حاضرین نے اس کے انداز کو خوب سراہا۔

دانیال طریر نے چند اشعار اور ایک تازہ نظم سنائی اور خوب تعریفیں سمیٹیں۔

قبل ازیں نئی کابینہ کی تشکیل کا مرحلہ طے کیا گیا۔ اس سلسلے میں اکیڈمی کے صدر وحید زہیر نے خطاب کرتے ہوئے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے اپنی کابینہ کی دو سالہ کارکردگی مختصراً بیان کرتے ہوئے کہا کہ دو برس کے عرصے میں تمام تر نا مساعد حالات کے باوجود ہم اکیڈمی کو جس قدر فعال رکھ سکتے تھے، اس کے لیے ہم نے بھرپور کوششیں کیں، اس حوالے سے کابینہ کے اراکین سمیت تمام دوستوں کا تعاون ہمیں حاصل رہا۔ جس کے لیے ہم آپ تمام احباب کے شکر گزار ہیں۔ امید ہے کہ نئی کابینہ اس تسلسل کو جاری رکھے گی۔

مالیات سیکریٹری کامریڈ کلیم نے اپنی کارکردگی کے حوالے سے بتایا کہ مالیات سیکرٹری کا عہدہ 2007 سے میرے پاس ہے۔ شروع میں لوگ کم تھے، پھر آہستہ آہستہ کارروان بنتا گیا۔ اب تک ہمارے رجسٹرڈ ممبران کی تعداد ساٹھ کے قریب ہے۔ ان چار سالوں میں ہمارے پاس جمع ہونے والے کل فنڈ کی مالیت 77000 روپے ہے، جن میں سے ماہانہ نشستوں میں ہونے والے اخراجات 18000 روپے ہیں۔ یوں اس وقت اکیڈمی کے پاس کل 58000 روپے موجود ہیں، جو جنرل سیکریٹری کے اکاؤنٹ میں جمع ہیں۔

وحید زہیر نے بتایا کہ ہمارے اخراجات نہایت قلیل رہے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر پوہ وزانت کے اخراجات دوستوں نے اپنی جیب سے بھی ادا کیے۔ اور ایک اہم بات یہ بھی کہ اب تک ہمارے کسی ممبر نے ہمیں چھوڑا نہیں ہے۔

اس نے ایک قرارداد پیش کی کہ عوام دوست لوگوں میں ایک عجز، ایک انکساری ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اس لیے اُن کی تنظیم میں سب سے اہم ذمہ داری یا، عہدے کو، ''چیئرمین'' یا ''صدر'' کہنا ایک فیوڈل طرز کی غمازی کرتا ہے۔ دنیا بھر میں عوامی جمہوری تنظیموں میں سب سے اہم عہدے کا نام ''سیکرٹری جنزل'' ہوتا ہے۔ اس لیے تجویز کی جاتی ہے کہ اکیڈمی کے آئین میں بنیادی تبدیلی لاتے

ہوئے موجودہ عہدوں کے طریقہ کار ختم کیا جائے۔اور سیکریٹری جنرل کا ایک مرکزی عہدہ قائم کیا جائے ۔جو اکیڈمی کے تمام امور کا ذمہ دار ہو۔

یوں نئی کابینہ مندرجہ ذیل عہدوں پر مشتمل؛

سیکریٹری جنرل، ڈپٹی سیکریٹری جنرل، پریس سیکریٹری وانچارج پوہ وزانت۔

اس قرارداد کو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔

اس کے بعد صدر نئی کابینہ کا انتخاب عمل میں لایا گیا:

سیکریٹری جنرل: ڈاکٹر منیر رئیسانی

ڈپٹی سیکریٹری جنرل: ڈاکٹر علی کمیل قزلباش

پریس سیکریٹری وانچارج پوہ وزانت: عابد میر

ایگزیکٹو باڈی: وحید زہیر، ڈاکٹر شاہ محمد مری، جاوید اختر، ساجد بزدار، شاہ محمود شکیب، ڈاکٹر نصر اللہ وزیر۔

اس کے بعد معروف ادیب، سینئر صحافی وانجمن ترقی پسند مصنفین کے مرکزی سیکریٹری جنرل جناب حمید اختر واردو کے معروف افسانہ نگار منشا یاد کی رحلت پر ایک تعزیتی قرارداد پیش کی گئی اوران کے لیے دعا کی گئی۔

(2)

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے سالانہ انتخابات کے بعد نو منتخب کابینہ و سنٹرل کمیٹی کا پہلا اجلاس نومبر کے آخری ایام میں منعقد ہوا۔

گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اکیڈمی کے سابق صدر وحید زہیر نے نئی کابینہ کو مبارکباد دی ،اور تمام احباب کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔اس نے کہا کہ ہم سے جتنا ہو سکتا تھا ہم نے اپنے طور پر اکیڈمی کو فعال رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔اس میں کچھ کوتاہیاں ضرور ہوئی ہوں گی ،لیکن اس میں ہمارا کوئی شعوری عمل دخل نہ تھا بلکہ حالات کا جبر شامل تھا۔دوستوں کا شکریہ کہ وہ ان مشکل حالات میں بھی ہمارے ساتھ رہے۔ہم امید کرتے ہیں کہ نئی قیادت اکیڈمی کو فعال رکھنے کے لیے بھرپور جدوجہد کرے گی۔ہمارا تعاون اسی طرح انہیں حاصل رہے گا۔

نومنتخب سیکریٹری جنرل ڈاکٹر منیر رئیسانی نے کہا کہ قیادت میں کوئی تبدیلی نہیں،صرف ذمہ داریاں کچھ بدل دی گئی ہیں۔گزشتہ برس بھی ہماری نشستوں میں خاصا تسلسل رہا۔بعض بہت ہی بھرپور نشستیں ہوئیں،بعض ذرا کم لیکن کام بہرحال ضرور ہوا۔کوشش یہ کریں گے کہ آج جو طے کر لیں آگے چل کر اس پر عمل کر سکیں۔

طے پایا کہ؛

- آئندہ برس سنگت کی سالانہ تقریبات جولائی میں ہوں گی۔
- یکم مئی،اور آٹھ مارچ کی تقریبات پوہ وزانت کا حصہ ہوں گی۔
- باہر سے کوئٹہ آنے والی شخصیات **سنگت پوہ وزانت** میں مہمان ہوں گی۔
- پوہ وزانت کے لیے سال بھر کے موضوعات کا تعین کیا جائے گا۔ہر سنگت کوئی ایک موضوع لے کر آئے گا۔

طے ہوا کہ پوہ وزانت کے اب دو حصے ہوں گے؛ پہلا سوشل سائنسز اور دوسرا ادب۔پہلے حصے میں سماجی موضوعات ہوں گے،دوسرے حصے میں شاعری اور افسانہ۔

سائیں کمال خان کی پہلی برسی کے حوالے سے سنگت کی جانب سے تقریب کے انعقاد پر تمام ساتھیوں نے اتفاق کیا۔متفقہ طور پر چار دسمبر کی مجوزہ تاریخ رکھی گئی۔اور یہ طے پایا کہ مزید معاملات طے کرنے کے لیے بیس نومبر کو سنٹرل کمیٹی کا پھر ایک اجلاس ہوگا۔تقریب میں مضامین کے لیے موضوعات طے کر لیے گئے،مقررین کے حوالے سے مشاورت کی جائے گی۔موضوعات درج ذیل طے پائے؛

- سائیں اور لٹ خانہ،سائیں بطور مترجم،سائیں بحیثیت انسان دوست،روشن فکر کمال خان
- نٹرل کمیٹی کا اجلاس ہر دو ماہ بعد ہوگا۔

اس کے علاوہ سنگت اکیڈمی کے منشور کی اشاعت کا فیصلہ ہوا۔اس سلسلے میں ایک تین رکنی کمیٹی بنائی گئی،جو آئندہ اجلاس میں اس سلسلے میں رپورٹ پیش کرے گی،جس کی روشنی میں منشور کو حتمی شکل دینے کے بعد اشاعت کے لیے بھیجا جائے گا۔

دسمبر:

سنگت کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس مورخہ 11 دسمبر، 2011 کو بہ مقام مری لیب، فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ منعقد ہوا۔اس کا ایجنڈا یہ تھا؛

- منشور کمیٹی کی رپورٹ
- سائیں کمال خان شیرانی سے متعلق تقریب کے معاملات

سیکریٹری جنرل کی رپورٹ:

منشور کمیٹی کے اراکین نے 15 دسمبر تک کی مہلت مانگی ہے،اس لیے اس سے متعلق معاملات فی الحال ملتوی کیے جاتے ہیں۔

- سائیں کمال خان سے متعلق تقریب کے حوالے سے گذشتہ اجلاس (منعقدہ 20 نومبر 2011) میں طے یہ پایا تھا کہ سائیں کمال خان کے حوالے سے ڈاکٹر شاہ محمد مری کی کتاب آنے کے بعد تقریب کا تعین ہوگا۔اس لیے اسے کتاب کی اشاعت تک ملتوی کر دیا گیا تھا۔اب ڈاکٹر صاحب کی کتاب آ چکی ہے اس لیے تقریب سے متعلق معاملات کو طے کرلیا جائے۔

فیصلہ ہوا کہ:

تقریب کا عنوان ''بیادِ سائیں کمال خان شیرانی ''ہوگا۔یہ تقریب ممکنہ طور پر 8 جنوری 2012 بروز اتوار، صبح گیارہ بجے منعقد ہوگی۔تقریب کا مقام بلوچی اکیڈمی کا حال ہوگا۔اس سلسلے میں رابطہ کاری کی ذمہ داری وحید زہیر کی ہوگی۔تقریب کے لیے ایک بڑا بینر بنایا جائے گا،اس کی ذمہ داری بھی وحید زہیر لے چکا ہے۔شرکا کی تعداد پچاس سے ساٹھ کے درمیان ہوگی۔تقریب کے حوالے سے ایک دعوت نامہ بنایا جائے،اس کی ذمہ داری عابد میر کی ہوگی۔تقریب کی حتمی تیاریوں کا جائزہ لینے کے لیے یکم جنوری 2012 کو سنٹرل کمیٹی کا اجلاس ہوگا۔

سال2012

جنوری:

بیادِ سائیں کمال خان شیرانی کوئٹہ و دیگر علاقوں سے آئے ہوئے ادیبوں اور قلم کاروں کی میت میں منایا گیا۔سائیں کمال خان شیرانی ژوب کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے پشتون

قوم سمیت انسان دوستی پر علمی وادبی کام کیا ہے۔بروز اتوار 8 جنوری کو سنگت اکیڈمی آف سائنسز کوئٹہ کے زیراہتمام پروگرام منعقد کیا گیا۔جس کے مہمان خصوصی ڈاکٹر انوار احمد تھے جبکہ نظامت کے فرائض پروفیسر ساجد نبی بزدار نے سرانجام دیتے ہوئے کہا کہ سنگت اکیڈمی بلارنگ و نسل، مذہب کے صرف انسان کی علمی بنیاد پر کام کرتی آرہی ہے۔سائیں کمال خان شیرانی پر مقالے پڑھنے والوں میں حفیظ اللہ شیرانی، کالا خان خروٹی، پروفیسر برکت شاہ کاکڑ، ڈاکٹر علی کمیل قزلباش اور وحید زہیر شامل تھے۔

پروگرام کے مہمان خصوصی ڈاکٹر انوار نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میرے لئے اعزاز کی بات ہے کہ میں اس عظیم شخصیت کے پروگرام میں شامل ہوں۔زبان اور قبیلہ کے حوالے سے ہمارا ایک گروہ ہے۔اس لئے ہم سب ایک قبیلے کے لوگ ہیں۔سائیں نے نئی نسل کی پرورش کا ذمہ اٹھایا ہوا تھا۔انہوں نے نسلوں کی آبیاری کی۔انسانوں کو تقسیم کرنے والوں کے خلاف کام کیا۔اپنی زندگی میں لوک کردار کے مالک ہیں۔بلوچستان میں سائیں کمال خان، ماما عبداللہ جمالدینی اور شاہ محمد مری جیسے لوگوں نے ایک نیا معاشرہ بنایا ہے۔

جیئند جمالدینی نے ماما عبداللہ جان کا پیغام سناتے ہوئے کہا کہ کمال خان شیرانی جیسا پشتون دانشور اس خطے میں پیدا نہیں ہوا۔وہ نہ بھولنے والی شخصیت ہیں۔انہوں نے سیاست، فکر اور انسان دوست فلسفے کے تحت عوام کے درمیان اپنی زندگی گزاری۔کمال خان کبھی نہیں مر سکتے۔

پروفیسر علی کمیل قزلباش نے اپنا مقالہ ''آدم عالم نما'' پیش کرتے ہوئے کہا کہ اہل معرفت کے لئے دل میں ہمیشہ جگہ رکھی جاتی ہے۔وہ ہمیشہ دلوں پر راج کرتے ہیں۔

وحید زہیر نے ''سلامتی صوفی'' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جہاں ملازمت غلامی، سیاست کا کوئی نظریہ نہ ہو عام لوگ برائیوں میں مصروف ہوں۔وہاں سائیں کمال خان ایک صوفی تھا۔عشق 'کمال' نے کیا تھا ہم تو لکیروں کے شیدائی ہیں۔

پروفیسر برکت شاہ کاکڑ نے اپنا مقالہ ''گوہر ہونے تک'' پیش کرتے ہوئے کہا کہ موقعہ پرستی فرد اور معاشرے کو ختم کر دیتی ہے۔میں پہلے سائیں کو نا کام شخصیت سمجھتا تھا لیکن جب سائیں کے کمالات دیکھے تو واقعی اندازہ ہوا کہ سائیں ہی کامیاب شخصیت کے مالک ہیں باقی ہم سب ناکام ہیں۔

حفیظ اللہ شیرانی نے اپنا مقالہ ''سائیں اور نوجوان'' پیش کرتے ہوئے کہا سائیں فرماتے

تھے کہ ہم انسانیت کی خدمت کے لئے پیدا ہوئے ہیں وہ نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے کہ:
''اپنا اصل مقصد سمجھو اور اس پر زندگی گزارو بغیر مقصد زندگی جانوروں کے مانند ہے۔''

کالا خان خروٹی نے اپنا مقالہ ''کوہِ سلیمان کا سنگ پارس'' پیش کرتے ہوئے کہا کہ سائیں کا اصل کام پسے ہوئے طبقے کے حقوق کی بات کرنا تھا۔ وہ عام لوگوں کو اولین ترجیح دیتے تھے۔ پروگرام کے آخر میں سیکریٹری جنرل منیر رئیسانی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ علم و دانش کے فروغ کے حوالے سے ہماری کوششیں جاری رہیں گی۔

مارچ:

سنگت اکیڈمی آٹھ مارچ اور یکم مئی کی عظمت کے پیشِ نظر ہمیشہ اجتماعات کرتی رہی ہے۔ 2012 کا یوم خواتین آئی ڈی ایس پی نامی علمی وسماجی ادارے کے ساتھ مل کر اُن کے دفتر میں منایا گیا۔ نور بانو نے سٹیج سنبھالا۔ اس نے تقریب کی مناسبت سے خواتین کی عالمی تحریک کا مختصر پس منظر بتایا۔ فرخندہ اسلم اور کمال جان نے آئی ڈی ایس پی اور اس کے کورس کا شرکا سے تفصیلی تعارف کروایا۔ پھر ایک مختصر سی دستاویزی فلم دکھائی گئی۔ یہ بالخصوص خواتین کے مسائل اور ان کی جدوجہد کے حوالے سے تیار کی گئی تھی۔

گلزار کی نظم پیش کی گئی، خواتین کے حوالے سے۔ خود گلزار کے دل موہ لینے والے ترنم اور دلوں کو چھو لینے والی موسیقی کا نور، نیرہ نور کی نور بہاتی آواز میں..... ''کتنی رسیاں کھولی ہیں میں نے، کتنی گرہیں باقی ہیں!'' خضدار کی کاوش محبوب کرد نے آئی ڈی ایس کی اکیڈمک کونسل کا تعارف کروایا۔

پروفیسر برکت علی کا کہنا تھا کہ 'جینڈر راینڈ کلاس' میں پہلی اہمیت کلاس کی ہے اور پھر صنف کی بات کی جائے کہ طبقات کے بطن سے ہی صنف کے مسئلے نے جنم لیا۔ اکبر ساسولی نے 'ماں' کے موضوع پر مختصر کہانی سنائی۔ جہاں آرا تبسم نے خواتین کے موضوع پر نظم سنائی۔ قلا خان خروٹی نے ماہنامہ سنگت کے عورت ایڈیشن کے لیے لکھا ہوا اپنا تازہ بہ تازہ مضمون سنایا۔ علی کمیل قزلباش نے طویل نظم سنائی۔ زلیخا نے 'ماں' سے متعلق چند سطریں سنائیں۔

سنگت اکیڈمی کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر منیر رئیسانی نے **سنگت** کا تعارف کروایا۔ اس کے اہداف و مقاصد سے حاضرین کو آگاہ کیا۔ اور آخر میں حالاتِ حاضرہ پر ایک پرتاثیر نظم سنائی۔

ساجدہ نے ایک عورت کے نقطہ نظر سے جو لکھا تھا، سنا دیا۔ صدرِ مجلس شاہ محمد مری نے جاتے ہی اپنے صدارتی خطبے کے پہلے ہی فقرے سے تمام حاضرین کو یہ کہہ کر سرشار کر دیا کہ، آپ سب کو مبارک ہو کہ لسانیت، فرقہ واریت، قبائلیت زنانیت ومردانیت سے بالاتر ہو کر آج ہم صرف آج کے دن کا جشن منانے کے لیے اکھٹے ہوئے۔ اسے یہ شکوہ بھی رہا کہ چونکہ یہ دن خواتین کی جدوجہد کے حوالے سے جیت اور جشن کا دن ہے، اس لیے اتنی زیادہ سنجیدگی اور مایوسی کی باتیں اچھی نہیں۔ ہم سب کے لیے تاریخ کے دو دن بڑے اہم ہیں؛ یکم مئی اور آٹھ مارچ۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نہ تو عورت صرف عورت کی جدوجہد کر کے کوئی تبدیلی لا سکتی ہے اور نہ مزدور صرف مزدور جدوجہد کے ذریعے معاشرے کو تبدیل کر سکتے ہیں، بلکہ سماجی تبدیلی کے لیے سماج کے تمام پسے ہوئے طبقات کو مل کر ایک بڑی لڑائی لڑنا ہوگی۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ جس نوعیت اور سطح کا سماج ہے اس کے لیے اسی نوعیت اور سطح کی تبدیلیوں اور حقوق کا مطالبہ کیا جائے۔ ہم نیم خانہ بدوش سماج کے لوگ ہیں، ہمارے لیے یورپی خواتین کی سطح کے حقوق کا مطالبہ شاید قبل از وقت ہوگا۔ لیکن ہمیں اپنے سماج میں عورتوں کے مسائل کو مرتب کر کے جدوجہد کرنی چاہیے۔

رازق فہیم کا کہنا تھا کہ معلوم انسانی تاریخ میں اب تک 14 ہزار سے زائد جنگیں ہو چکی ہیں، اور ان میں سے اٹھانوے فیصد جنگیں مردوں نے ہی لڑی ہیں، جب کہ آج بھی تشدد کے بانوے فیصد واقعات میں مرد ملوث بتائے جاتے ہیں۔ خلاصہ اس کی گفتگو کا یہ تھا کہ مرد وزن ہر دو کی فلاح ایک دوسرے کے ساتھ برابر کی سطح پر مل جل کر رہنے میں ہے، ایک دوسرے کو برتر و کمتر ثابت کرنے میں نہیں۔

اپریل:

سنگت پوہ زانت، کوئٹہ کے دگرگوں حالات کے باعث ایک ہفتے کی تاخیر سے بالآخر اپریل کے آخری اتوار منعقد ہو کر ہی رہی۔ پوہ زانت کی نشست 22 اپریل کو منعقد ہوئی، جس کے ایک روز بعد عالمی یوم کتاب منایا جا رہا تھا۔ اس دن کی روایت کے پس منظر کے حوالے سے انچارج **پوہ و زانت** نے عارف عزیز کی ایک مختصر تحریر دوستوں کے ساتھ شیئر کی، تا کہ ایک تو جو دوست اس سے آگاہ نہ تھے، انہیں بھی آگاہی حاصل ہو، دوم اس خواہش کا اظہار کہ اس مبارک دن کے موقع پر کتاب

دوست احباب کتاب گھروں اور کتاب خانوں کا رخ کریں، کوئی اچھی کتاب ضرور خریدیں، کوئی اچھی کتاب کسی اچھے دوست کو تحفہ دیں، کوئی ایک اچھی کتاب پڑھنے کا تہیہ کر لیں۔

اس کے بعد سٹیج **پوہ و زانت** کے مہمان خاص آغا گل کے حوالے کر دیا گیا۔

آغا گل نے سنگت اکیڈمی کی جانب سے اس پذیرائی کا ایک رسمی شکریہ ادا کیا۔ اس نے بلوچستان میں فکشن پر اپنا مضمون پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان کو روزِ اول سے کہانیاں کہنے اور سننے کا شوق رہا ہے۔ افسانہ یا کہانی فراعین کے دور میں بھی لکھے جاتے تھے۔ لکھاریوں پر ہر دور میں پابندی رہی ہے جو مختلف شکلوں میں آج بھی قائم ہے۔ سماجی دباؤ بڑھتا ہے تو افسانہ نگار علامتوں کا سہارا لینے لگتے ہیں، مگر لکھتے ضرور ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ بلوچستان میں افسانے کی عمر کم ہے، یہاں داستانوں کا رواج رہا ہے۔ اردو افسانہ لکھنے والوں کی بلوچستان سے وابستگی نہیں رہی، لہٰذا ان کے افسانوں میں مقامی رنگ نہ آنے پایا۔ بلوچستان کے اردو لکھنے والوں کی زیادہ تر تعداد باہر سے آئی تو اپنا ناسٹیلجیا بھی ساتھ لائی جو عمر بھر ان کے ساتھ رہا، ان کے جسم تو ہجرت کر آئے لیکن ان کے ذہن وہیں رہ گئے، اس لیے وہ یہاں رہ کر بھی ہمیشہ 'وہاں' کی سوچتے رہے۔ بلوچستان کے افسانے میں رومانیت تو رہی مگر بلوچستان نہ جھلک سکا۔ یہ بلوچستان میں فکشن کا ابتدائی دور ہے۔ بلوچستان میں فکشن کا دوسرا دور افغان جنگ سے شروع ہوتا ہے۔ عموماً یہ دبے دبے لہجے کے افسانے ہیں۔ ان میں رومانس نمایاں رہا، کیونکہ سرکار نے محبت پہ کوئی قدغن نہیں لگائی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمارے سکولوں، کالجوں میں وہی کچھ پڑھایا جاتا ہے جو کہ سرکار کو پسند ہے۔ اَن پڑھ لوگ اسمبلیوں میں آئے تو کتاب بے توقیر ہوئی، لہٰذا فکشن دم توڑنے لگا۔ ادبی طور پر اردو کی حد تک بلوچستان کا کوئی لکھاری نہیں جو کوئی اہم افسانے لکھ سکے۔ نئی نسل کو اجالا دکھا سکے۔

اس نے اپنے چند افسانوں کی مثالیں دیں کر بلوچستان کے مقامی رنگ کو پینٹ کرانے کی کوشش کی ہے۔

مئی:

سنگت پوہ و زانت کی نشست 20 مئی 2012 کی شام پروفیشنل اکیڈمی میں ہوئی۔ اس بار پوہ و زانت کی نشست کا موضوع ذرا غیر روایتی سا تھا۔ اور یہ موضوع تھا۔ اسٹڈی

شیئرنگ، یعنی سنگت کے دوستوں نے حال ہی میں جو کچھ پڑھا ہے، اسے ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کریں تاکہ اس طرح ایک دوسرے کے مطالعے سے آگاہی ہو، نئی کتابوں کا علم ہو، اور ہر ساتھی کو اپنا حاصلِ مطالعہ باقی دوستوں کے ساتھ شیئر کرنے کا موقع مل سکے۔

عابد میر کی حال ہی میں زیرِ مطالعہ رہنے والی کتابوں میں پہلی کتاب تھی، فاطمہ مرنیسی کی ''شہرزاد مغرب میں''۔ اس نے بتایا کہ نسائیت کے موضوع پر اس سے قبل اس کی دو کتابیں ترجمہ ہو کر شہرت پا چکی ہیں؛ ''حدود شکنی کے خواب'' اور ''حجاب سے آگے''۔ مذکورہ کتاب حال ہی میں زاہدہ حنا صاحبہ نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہے۔ اس کتاب میں خاتون نے عورتوں سے متعلق مغرب کے رویے کو ایک مختلف زاویہ نظر سے دیکھا ہے، اور اپنے تجربے و تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر مشرق میں عورت کو ''برقعے'' کی قید میں ڈالا گیا ہے تو مغرب میں عورت کو خوبصورتی اور سمارٹنیس کے نام پر ''سائیز، 6'' کی قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ برقعے کی نسبت یہ بظاہر ایک نظر نہ آنے والا پنجرہ ہے۔ دوسری کتاب، پروفیسر رابرٹ جی ورسنگ کا ایک مقالہ ہے جو اس نے بلوچ سیاست کے حوالے سے کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا، اب یہ کتابی صورت میں ترجمہ ہو کر ''بلوچ قوم پرستی اور توانائی کی سیاست'' کے عنوان سے چھپا ہے۔ مصنف نے بلوچ قوم پرست سیاست کو ایک الگ تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، اور خاصی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہاں جیئند جمالدینی صاحب نے ایک وضاحت کی کہ یہ بنیادی طور پر ورسنگ کی کتاب کے ایک باب کا ترجمہ ہے، اصل کتاب خاصی ضخیم ہے، جو اس نے توانائی کی عالمی سیاست کے تناظر میں لکھی ہے۔ علاوہ ازیں عابد نے دو اور کتابوں کا تذکرہ کیا جو اس نے حال ہی میں پڑھیں جناب ضمیر نیازی کی مشہورِ زمانہ کتاب Press in Chains، پاکستان کے قیام سے لے کر ضیا دور تک پاکستانی پریس کی مفصل داستان بیان کرتی ہے۔ دوسری کتاب ''باغبانی صحرا'' کے نام سے ان کے انٹرویوز پر مشتمل ہے، جو اس عظیم آدمی کے کام، نظریات اور شخصیت کا مکمل خاکہ پیش کرتی ہے۔

ڈاکٹر نصراللہ وزیر نے بتایا کہ حال ہی میں اس نے ایڈورڈ سعید کی کتاب ''کلچر اینڈ اوریئنٹیل ازم'' کا ترجمہ پڑھا ہے۔ بنیادی طور پر اس کتاب میں ایڈورڈ سعید نے یہ نقطہ اٹھایا ہے کہ جب کوئی ملک کسی دوسرے ملک کو اپنی نوآبادی بناتا ہے تو فاتح ملک کے ادیب اپنے ادب میں مختلف

انداز سے اس کا دفاع کرتے ہیں، جبکہ مفتوح ملک کے ادیب اس کے خلاف ادب تخلیق کرتے ہیں۔
دوسری کتاب گیان چند جین کی ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو ادب'' جستہ جستہ پڑھی ہے، جس میں انہوں نے اردو ہندی تنازعے کو ایک نئے زاویے سے دیکھا ہے۔ اردو دان طبقے کی تنگ نظری اور تعصب کو اس نے کھل کر بیان کیا ہے۔ کئی نئی چیزیں ہیں، جو اس کتاب کے ذریعے پہلی بار نظر سے گزریں۔ تیسری کتاب سید خیر محمد عارف کی شاعری ہے۔ اس سے مجھے پشتو رسم الخط کے معاملے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔

سرور خان نے کہا کہ میں تو ایسی سادہ کتابیں پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں، جو ہماری ذہنی سطح کے مطابق لکھی گئی ہوں، اور اس طرح کی کتابیں آج کل ہمارا شاہ محمد مری لکھ رہا ہے، تو میں نے ان دنوں اس کی کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔ جن میں عشاق کے قافلے کی سیریز کی دو کتابیں سائیں کمال خان شیرانی، شاہ عنایت شہید اور حال ہی میں شائع ہونے والی وفا کا تذکرہ شامل ہیں۔

تازہ ترین مطالعے کے شوقین جیئند خان نے یہ کہہ کر دوستوں کو حیران کیا کہ وہ گذشتہ ایک برس سے کسی نئی کتاب کا مطالعہ نہیں کر پایا۔

شاہ محمود شکیب نے بتایا کہ وہ ان دنوں ایک کتاب کا ترجمہ کر رہا ہے، اس لیے کچھ نیا پڑھ نہیں پایا۔ یہ ''ایرانِ باستان'' کے نام سے ایک فارسی کتاب ہے، جو قدیم ایرانی تہذیب سے متعلق ہے، اس میں وہ بلوچوں کے تذکرے سے متعلق باب کا ترجمہ کر رہا ہے۔ اس نے بتایا یہ قبل از مسیح تہذیب سے متعلق ہے اور یہ مختلف مورخوں کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ وہ وقت ملنے پر 'گولڈن ایج' نامی ایک کتاب کا جستہ جستہ مطالعہ کرتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ یونان کی ایک قدیم کتاب ہے، جو ناول کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس میں عورت کے دو روپ دکھائے گئے ہیں، کہ ایک طرف وہ دہشت ناک، اور درندے کی مثال ہے تو دوسری طرف محبت اور شفقت ہے۔ مصنف اس کا اختتام دوسرے نتیجے پر کرتا ہے۔

محمود ابڑو نے بتایا کہ حال ہی میں کوئی کتاب تو اس کے زیر مطالعہ نہیں رہی، لیکن چند رسائل اس کی نظر سے گزرے۔

اکبر ساسولی کا کہنا تھا کہ اس نے حال ہی میں فاروق بلوچ کی کتاب ''خانِ اعظم

میر نصیر خان نوری'' کا مطالعہ کیا ہے۔ جس میں نصیر خان نوری کے کردار اور شخصیت کو بڑی تفصیل سے اور موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پروفیسر جاوید اختر نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اس نے یہ کتاب پڑھی ہے، مصنف نے اس قسم کی کئی غلطیاں کی ہیں، اور تاریخی طور پر یہ ایک نہایت کمزور کتاب ہے۔ نیز اکبر ساسولی نے بھی کتاب میں موجود ایک غلطی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مصنف نے ایک جگہ محمود غزنوی کے دور میں فردوسی کو ملک الشعرا لکھا ہے جبکہ اس وقت یہ خطاب قلسوری کے پاس تھا۔ یہاں شاہ محمود شکیب نے ایک دلچسپ وضاحت کی کہ **شاہنامہ** اصل میں محمود غزنوی کے دربار سے وابستہ ایک اور شاعر نے شروع کیا تھا جو اس دوران بیماری کا شکار ہو کر مر گیا۔ وہ صرف دو ہزار اشعار ہی لکھ پایا تھا۔ بعدازاں فردوسی نے آ کر شاہ کے حکم پر اسے مکمل کیا۔ اور مزید ساٹھ ہزار اشعار لکھے۔ یوں شاہنامہ کل باسٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس سے متعلق یہ مشہور روایت بھی غلط العام ہے کہ بادشاہ اس کے عوض طے شدہ رقم دینے سے مکر گیا، بعدازاں غلطی کا احساس ہونے کے بعد جب اس نے مطلوبہ رقم بھجوائی تو ایک طرف سے جب اشرفیوں سے لدے اونٹ شہر میں داخل ہو رہے تھے تو دوسرے دروازے سے شاعر کا جنازہ جا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ بادشاہ کے مکر جانے پر فردوسی اتنا مایوس ہوا کہ بیمار پڑ گیا۔ بعدازاں جب بادشاہ نے مطلوبہ رقم اسے بھجوائی تو وہ بستر مرگ پر تھا۔ جہاں اشرفیاں وصول ہونے کے بعد اس نے فارسی میں ایک شعر بھی کہا۔ جس کا مفہوم کچھ یوں بنتا ہے کہ ، گدھے کی موت کتوں کے لیے خوشی کی رات ثابت ہوتی ہے۔ یعنی اب جو پیسے تم نے بھجوائے ہیں، یہ میرے تو کسی کام کے نہیں، اس پر میرے ورثا ہی عیش کریں گے۔ نیز اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ یہ روایت بعدازاں گھڑی گئی، جب صفوی عہد میں ایران میں تنگ نظری کو فروغ حاصل ہوا۔ اس عہد میں حتیٰ کہ حافظ کے کئی کلام میں کئی جگہ تحریفات کی گئی ہیں۔ بعدازاں اکبر ساسولی نے اپنے مطالعے کا مزید احوال دیتے ہوئے بتایا کہ اس نے حال ہی میں آغا گل کے افسانوں کی کتاب ''پرندہ'' پڑھی۔ اکبر ساسولی نے اپنے تازہ مطالعے میں ایک اور کتاب ''چلتن سے چین تک'' کا بھی تذکرہ کیا۔

سنگت عبداللہ دشتی نے بتایا کہ سردار خان گشکوری کی بلوچ تاریخ پر لکھی گئی کتاب ''ہسٹری آف بلوچ ریس'' ان دنوں اس کے زیر مطالعہ ہے۔

ماہنامہ ''سنگت''، کثیر المطالعہ وحید زہیر صاحب کے زیر مطالعہ رہا۔ جس کے متعلق اس کا

کہنا تھا کہ اس بار ''سنگت'' خاصا کمزور تھا۔ بالخصوص ترتیب بالکل نہیں تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے کہ جو مضمون پہلے کمپوز ہوا، یا ایڈیٹر کے پاس جو پہلے پہنچا، اسی کو پہلے شائع کر دیا۔ مثلاً آغاز میں شامل پہلے دو تین مضمون اتنے کمزور ہیں کہ، پہلی بار 'سنگت' پڑھنے والا کوئی قاری شاید اس سے آگے پڑھنے کو تیار ہی نہ ہو۔ حالانکہ بعد میں کئی معیاری چیزیں بھی شامل ہیں، لیکن غلط ترتیب کے باعث ان کا اِمپریشن بھی خراب ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کا کہنا تھا کہ سنگت کے دوستوں کو جریدے میں ضرور شمولیت کرنی چاہیے۔ ضروری نہیں کہ آپ کچھ نہ کچھ لکھیں، جو چیزیں آپ پڑھتے ہیں، ان میں سے اگر کوئی ایسی چیز جو آپ کو اچھی لگے اور آپ سمجھتے ہوں کہ اسے دوستوں کے ساتھ شیئر کرنا چاہئے، ایڈیٹر تک پہنچا دیں تا کہ وہ رسالے میں شامل ہو کر زیادہ دوستوں تک پہنچ سکے۔ نیز ایڈیٹر کو بھی بعض مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں کچھ دوستوں سے مشورہ کر لینا چاہئے تا کہ رسالے کا معیار متاثر نہ ہو۔

پروفیسر جاوید اختر نے بتایا کہ حال ہی میں اس نے فریڈرک جیمسن کی کتاب Political Unconsciousness ختم کی ہے۔ یہ امریکی نقاد، پروفیسر اور مارکسسٹ ہے۔ اس نے ادب کا مارکسی جائزہ لیا ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔ اسی مصنف کی ایک اور کتاب Marxism and Form بھی میں نے حال ہی میں پڑھی ہے۔ جس میں اس نے مارکسزم اور جمالیات کے تعلق کو دیکھا ہے۔ ٹونی بلینٹن کی ''فارمل ازم اینڈ مارکس'' بھی اس نے پڑھی ہے۔ مصنف کا تعلق ماسکو سے ہے۔ ایک اور کتاب جو ایک طرح کا ناول ہے، میں نے حال ہی میں پڑھی ہے۔ اس کا نام ہے، ''ہیومن کامیڈی''۔ اسے فرنچ مصنف بالزاک نے لکھا ہے۔ یہ فرانس کے نوآبادیاتی دور کا احوال ہے جب اشرافیہ اور ری پبلکن پارٹی میں جنگ چل رہی تھی۔ بالزاک کی ہمدردیاں حالانکہ اشرافیہ کے ساتھ تھیں، لیکن کتاب میں اس نے اپنی ذاتی ہمدردیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حقائق کو بیان کیا ہے۔ اس نے اشرافیہ کے زوال اور ری پبلک کے حق میں لکھا۔ ایک اور کتاب جو حال ہی میں پڑھی، یہ بھی ناول ہے اور ایک فرانسیسی مصنف ہی کا تحریر کردہ ہے۔ ہنری باربے سے، دوسری عالمی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ایک تشدد پسند تھا، لیکن جنگ کی ہولناکیاں دیکھنے کے بعد وہ جنگ مخالف ہو گیا۔ لینن کی پیش گوئی کے مطابق وہ انقلابیوں کا سرخیل بن گیا۔ اس نے فرانس میں دنیا بھر کے ادیبوں کی ایک کانفرنس منعقد کی، جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ ادب کو ہر

صورت میں جنگ مخالف ہونا چاہیے۔ ہندوستان سے سجاد ظہیر وغیرہ اس میں شامل ہوئے۔ اسی کے نتیجے میں بعد ازاں انہوں نے ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی۔ ناول کی کہانی ایک طرح سے مصنف کے حالات کے گرد گھومتی ہے۔ وہ اس میں ٹیری ایگلٹن کی لٹریری تھیوری کو بھی زیرِ بحث لاتا ہے، جس نے ادبی نظریات کو مارکسی تناظر میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں ایک کتاب ''ترقی پسند ادب کے فکری مباحث'' دیکھی۔ اسے حمیرا اشفاق نے ترتیب دیا ہے۔ خاصی ضخیم کتاب ہے، لیکن سارے پرانے مضامین جمع کیے گئے ہیں، کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مجھے اس کتاب سے بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کی نسبت کچھ عرصہ قبل میں نے احمد پراچہ کی ترتیب دی ہوئی ترقی پسند تحریک سے متعلق ایک کتاب دیکھی تھی، وہ ایک بہتر کام تھا۔ اس کے علاوہ حال ہی میں امجد طفیل کی کتاب ''ادب کا عالمی دریچہ'' پڑھی۔ اس میں انہوں نے نئے تنقیدی مباحث کا جائزہ لیا ہے، ساتھ ہی بعض اہم کتابوں پر تبصرے بھی کتاب کا حصہ ہیں۔ مجموعی طور پر ایک اچھی کتاب ہے۔

کتابوں کے تفصیلی تذکرے کے بعد اس نے بتایا کہ اس دوران چند رسائل بھی اس کی نظر سے گزرے ہیں۔ جس میں ایک راولپنڈی سے شائع ہونے والا بائیں بازو کا رسالہ ''عوامی مزاحمت'' بھی شامل ہے۔ اس میں بالخصوص عاصم سجاد اختر کا ایک مضمون اہم تھا، جس میں اس نے یہ کہا ہے کہ یورپ میں کیونکہ اب عام آدمی خوشحال زندگی گزارتا ہے، اس لیے وہاں اب کوئی انقلاب نہیں آ سکتا۔ جس سے ہمارے محترم سرور خان بھی اتفاق رکھتے ہیں، لیکن یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ جب سرمایہ داری کو وقتی عروج ملتا ہے اور بظاہر لوگوں کا معیارِ زندگی بہتر ہونے لگتا ہے، قوتِ خرید میں اضافہ ہوتا ہے تو ہمیں لگتا ہے کہ اب یہ سسٹم تو چل پڑا ہے، اس لیے اس کو قبول کر لینا چاہیے، اور اس میں رہتے ہوئے دیگر معاملات کا حل تلاش کرنا چاہئے۔ مارکسسٹ اسے ترمیم پسندی کہتے ہیں۔ لینن نے اس پر بڑی وضاحت سے لکھا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں اس سے بچنا چاہیے۔

سنگت اکیڈمی کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر منیر رئیسانی نے بتایا کہ حال ہی میں اس نے ڈاکٹر شاہ محمد مری کی عشاق کے قافلے سیریز کی دو کتب **شاہ عنایت شہید**، اور **ھوچی منہ** پڑھی ہیں۔ دونوں ہی معلومات افزا اور متاثر کن تھیں۔ اس سے قبل اس نے کشور ناہید کی آپ بیتی ''بری عورت کی کتھا'' پڑھی، اور خاتون کی بہادری اور جراتِ اظہار سے متاثر ہوا۔ تحریر کے اختصار پن نے بھی

اسے مرعوب کیا۔ساتھ ہی گلزآر کی شاعری کی کتاب''پندرہ پانچ پچھتر'' پڑھی......ظاہر ہے متاثر ہوا۔اس کے علاوہ سنگت پڑھا۔اس میں وحید زہیر کا مضمون 'واسو سے ایک ملاقات' خصوصاً پسند آیا۔

آخری مقرر تھا،سنگت رفیق۔اس نے واقعتاً اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنے حالیہ مطالعے میں ایک ہی کتاب کا تذکرہ کیا۔اس نے بتایا کہ کچھ دن پہلے ہی ڈاکٹر شاہ محمد مری کی کتاب''بلوچ قوم،عہد قدیم سے ریاست کی تشکیل تک'' پڑھ کر ختم کی ہے۔اس کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر صاحب تاریخ جیسے خشک موضوع کو افسانوی انداز میں سہل بنا کر پیش کرتا ہے۔نیز اس نے اپنی کتاب میں ایک نیا زاویہ دیا ہے،اس سے قبل بلوچوں کے متعلق کبھی کہا جاتا رہا ہے کہ یہ حلب سے آئے،کبھی کہا گیا کہ یہ کیسپئن سے آئے،لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ بتایا ہے کہ اصل بلوچ وہی ہے جو مہرگڑھ میں موجود تھا،باقی باہر سے آنے والی نسلیں یہاں آتی اور ضم ہوتی گئیں۔

جون:

سنگت پوہ وزانت کی ماہانہ فکری نشست 24 جون 2012ء کی شام پروفیشنل اکیڈمی میں منعقد ہوئی۔اس محفل کے شرکا تھے؛ڈاکٹر منیر رئیسانی،افضل مراد،جاوید اختر،شاہ محمود شکیب،ڈاکٹر نصراللہ وزیر،شاہ محمد مری،اکبر ساسولی،قلا خان خروٹی،عبداللہ دشتی،عابد میر......جبکہ کچھ نئے چہرے بھی تھے،جن میں گلزار کنڈرانی،طاہر احمد،فرید احمد اور عبدالرزاق مری شامل تھے۔پوہ و زانت کی اس نشست کا موضوعِ گفتگو تھا؛Intellectual Inspiration،یعنی ایسی کوئی شخصیت،کوئی کتاب،کوئی واقعہ،کوئی چیز جس نے آپ کو دانشورانہ سطح پر متاثر کیا ہو یا مہمیز دی ہو۔

مکالمے کا آغاز ڈاکٹر منیر رئیسانی سے ہوا۔ان کا کہنا تھا کہ میں میٹرک کا طالب علم تھا،ہمارے ایک بزرگ نے مجھے 'دستِ صبا' لا کر دی۔ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ خیال کرنا کمیونسٹ آدمی ہے،کہیں متاثر نہ ہو جانا۔یہ واقعہ بنیادی وجہ بنا شاعری سے رغبت کا۔انسپائریشن اس سے ملی۔اور پھر ایک سلسلہ چل نکلا۔تازہ مطالعہ کے حوالے سے بتایا کہ ادبی سلسلہ''آج'' کا ایک پرانا شمارہ پڑھا۔

جناب افضل مراد نے دانشورانہ تاثر کے حوالے سے کہا کہ میری زندگی میں ایک طویل فہرست ہے ایسے لوگوں کی جن سے مسلسل سیکھنے کو ملا۔عبدالرحمان غور،نادر قمبرانی،خادم میرزا،ڈاکٹر عبدالرحمان براہوی...... یہ وہ لوگ تھے،جن کے کام سے انسپائریشن سے زیادہ حیرت ہوتی

تھی کہ کیسے یہ لوگ اتنا سب کر لیتے ہیں!تازہ مطالعے کے ضمن میں انہوں نے بتایا کہ علی محمد فرشی کی ادارت میں شائع ہونے والے مجلّے کا نظم نمبر ان کے زیرِ مطالعہ رہا ہے۔

پروفیسر جاوید اختر صاحب کا کہنا تھا کہ انسپائریشن کے حوالے سے مختصراً اتنا کہوں گا کہ دس،بارہ سال سے جنگ کوئٹہ کا ادبی صفحہ باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔اس میں بہت سی چیزیں پڑھ کر میں نے وہاں سے خاصی انسپائریشن لی ہے۔اس کے بعد انہوں نے اپنا وسیع مطالعہ نہایت صراحت کے ساتھ شیئر کیا۔ڈاکٹر نصراللہ وزیر کا کہنا تھا کہ انسپائریشن تو کچھ خاص نہیں رہی لیکن معاشرے کو بدلنے کی خواہش شروع سے رہی۔اس کا اظہار البتہ کم ہی ہو پایا۔اس کی پھر اپنی وجوہات ہیں۔تازہ مطالعے میں انہوں نے ایڈورڈ سعید کی کتاب''پیٹرن آف کلچر'' کے اردو ترجمے کا ذکر کیا۔

نئے سنگت،نوجوان طالب علم فرید احمد کا کہنا تھا کہ انہوں نے کچھ عرصہ قبل ہاشم ندیم کا ایک ناول''خدا اور محبت'' پڑھا،جس نے انہیں شدید متاثر کیا۔پھر ان کا ایک اور ناول''عبداللہ'' پڑھنے کو ملا۔اس کے بعد پھر ان کے سارے ناول تلاش کر کے پڑھے۔تازہ مطالعے میں انہوں نے بلوچستان کے نوجوان کالم نویس شعیب خان کی تازہ کتب کا ذکر کیا،جو ان کے زیرِ مطالعہ رہی ہیں۔

اکبر ساسولی نے سنگت کے بزرگوں کو اپنی انسپائریشن کا ذریعہ بتایا۔جبکہ تازہ مطالعے میں انہوں نے فاروق بلوچ کی کتاب''بلوچ اور ان کا وطن'' کا تذکرہ کیا۔جس سے وہ خاصے محظوظ اور متاثر ہوئے ہیں۔

قلا خان خروٹی کا کہنا تھا کہ کوئی ایک نقطہ نہیں ہے متاثر کن،بہت ساری چیزوں نے مل کر اثر ڈالا۔پشتو اور فارسی سے تعلق رہا۔سعدی اور پھر رحمان بابا کو بہت پڑھا۔ادبی تنظیموں سے بھی تعلق رہا،ان سے بھی بہت کچھ سیکھا۔تازہ مطالعے میں ایک پرانی کتاب''بریکنگ دی کرفیو'' ہے۔

عبداللہ دشتی نے بتایا کہ ان کی انسپائریشن کا ذریعہ ان کے استاد اور مقامی شعرا رہے۔جو مختلف کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔حالیہ مطالعے میں فاروق بلوچ کی کتاب''نوری نصیر خان'' کا تذکرہ کیا۔ان کا کہنا تھا کہ مصنف نے ان کی شخصیت کو خاصا بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے،لیکن مکران میں ان کے متعلق کچھ اچھی رائے نہیں پائی جاتی۔

ایک اور نئے دوست،طاہر احمد نے کہا کہ انہوں نے کچھ عرصہ قبل''صوفی کی دنیا'' پڑھی

تھی، جس نے انہیں شدید متاثر کیا، اور وہ چاہتے ہیں کہ ہر شخص کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

گلزار کنڈ رانی نے اپنی انسپائریشن کا ذریعہ دادا، دادی کی قصہ کہانیوں کو قرار دیا۔ یہ نوجوان کمیشن کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں، اس لئے 'کچھ نیا' نہیں پڑھ رہے۔

شاہ محمود شکیب نے کہا کہ میرا تعلق فارسی ادب سے ہے۔ فارسی اور بلوچی میں شاعری بھی کرتا ہوں۔ باقی کس سے متاثر ہوا، یہ بتانا غیر ضروری ہے۔ اور پھر انہوں نے ہمیں 27 سال قبل نور جہاں کے مزار پر لکھی گئی اپنی ایک فارسی نظم سنائی۔

شاہ محمد مری بتایا کہ انہوں نے حال ہی میں ایک ناول 40 ways of love پڑھا ہے۔ یہ الف، شفق نامی ایک ترک خاتون کا ناول ہے۔ بہت شاندار کتاب ہے۔ تمام دوستوں کو پڑھنی چاہیے۔ دوسرا بھی ایک ناول ہے پاولو کوہیلو کا 'الف' کے نام سے۔ یہ بھی ایک اچھا ناول ہے۔ اس کے علاوہ کارل ساگاں کی ایک کتاب پڑھی ہے۔ اس کا موضوع دلچسپ ہے کہ سائنس دان بھی بعض اوقات کس طرح توہمات پر چل رہے ہوتے ہیں۔ آخری چیز ٹام پین کا ایک پمفلٹ 'کامن سینس' ہے جو میں نے حال ہی میں پڑھا ہے۔

یوں نشست اختتام کو تھی۔ لیکن شعری حصہ میں شاہ محمود شکیب صاحب نے سائیں کمال خان کی بشر دوستی پر اپنی ایک نظم سنائی، تو دیگر شعرا سے بھی فرمائش ہوئی۔ اکثر ٹال مٹول گئے۔ ڈاکٹر منیر رئیسانی نے اس کر بھرم رکھا، اور کچھ تازہ شعر سنا کر، تر و تازہ کر دیا۔

جولائی:

15 جولائی کی شام شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ یہ شعری نشست بالخصوص سنگت اکیڈمی کے کراچی سے آئے ہوئے دوست عمران ثاقب اور حال ہی میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں نوکری ہونے کے بعد اسلام آباد منتقل ہونے والے، سنگت اکیڈمی کے ڈپٹی سیکریٹری ڈاکٹر علی کمیل قزلباش کے اعزاز میں رکھی گئی۔ یہ نشست 15 جولائی بروز اتوار کی شام پروفیشنل اکیڈمی میں منعقد ہوئی۔

اس نشست کے شرکا تھے؛ شاہ محمود شکیب، جاوید اختر، شاہ محمد مری، علی کمیل قزلباش، عظمیٰ

قادری بلوچ، پروفیسر برکت علی، محمد سرور، ہانیا خان، عمران ثاقب، فرید احمد، ذاکر شیران، محمد ابراہیم، اکبر ساسولی، عبداللہ دشتی، سرفراز احمد، فیصل گوندل، دانیال طریر، جوہر بنگلزئی اور عابد میر۔

شعرا نے تو اپنا کلام سنایا ہی، نشست کے آخر میں شاہ محمد مری نے اپنے بچپن کے استاد عبدالکریم ظہیری کے اشعار اور ان افکار سے بھی حاضرین کو محظوظ کیا۔

ستمبر:

فہمیدہ ریاض آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے زیر اہتمام چلڈرن فیسٹیول میں شرکت کے لیے کوئٹہ آئی ہوئی تھی۔ **سنگت اکیڈمی** نے فہمیدہ کے اعزاز میں تقریب منعقد کی۔ سنگت کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر منیر رئیسانی نے سنگت کے مختصر تعارف کے بعد محفل فہمیدہ کے حوالے کر دی۔

وہ بولی، خوب بولی اس لیے کہ بلوچستان سے اُس کا پیار اُس سے ''بلواتا'' ہے۔ فہمیدہ بتاتی ہے کہ ''بھٹو کا دور آیا تو ہمارے کئی سوشلسٹ کارکن اس کے گرد جمع ہو گئے۔ میں تب بھی بھٹو کے خلاف تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سوشلزم کو استعمال کر رہا تھا۔ اور پھر وہی ہوا کہ اس نے نیپ کی حکومت کو برطرف کر دیا۔ بلوچستان میں شورش شروع ہو گئی۔ اُن دنوں خبر کے ذرائع محدود ہوتے تھے، ہم تک تو درست اطلاعات بھی نہیں پہنچ پاتی تھیں۔ میری بی ایس او کے کچھ لڑکوں سے ملاقاتیں ہوئیں تو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ میں حالات کا جائزہ لینے کے لیے خود کوئٹہ آ گئی۔ یہاں میری ملاقات بلوچ رہنماؤں سے ہوئی۔ گل خان نصیر ان دنوں جیل میں تھے۔ میں ان سے وہیں پہ ملی۔ بلوچوں کی بڑی جائز شکایات تھیں۔ میں نے پھر ادیبوں کی ایک دستخطی مہم شروع کی، جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ بلوچوں کے خلاف آپریشن بند کیا جائے اور عوام کے مطالبات منظور کیے جائیں۔ یہاں سے میں پھر پنجاب گئی۔ وہاں تو ادیب میری بات سننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بلوچ، انڈیا کے بہکاوے میں آ گئے ہیں، یا وہاں کے سردار انہیں بہکا رہے ہیں تاکہ وہاں ترقی نہ ہو۔ میں بڑی مشکل سے ادیبوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سمجھاتی رہی لیکن میری بات کو پذیرائی نہ مل سکی۔ واپسی پہ میں نے اس پہ ایک تفصیلی مضمون لکھا۔

پھر ضیا کا دور آیا تو سختیاں مزید بڑھ گئیں۔ لوگوں کو سرعام کوڑے مارے جانے لگے۔ اکثر ادیب جان بچا کر بھاگ نکلے۔ مجھے بھی جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔ میں نے تقریباً سات برس انگلینڈ

میں گزارے۔اس دوران میں بی بی سی میں بھی لکھتی رہی۔ پھر 1983 میں میری واپسی ہوئی۔تب چیزیں کافی بدل گئی تھیں۔بھٹو کی نسبت بے نظیر میں ہمیں کچھ امید نظر آتی تھی۔اور وہی آخری امید تھی۔ اس کے بعد تو اب جو عالم ہے وہ آپ سب کے سامنے ہے۔

بلوچستان میں اس دوران بھی جو کچھ بیتا اس پہ میں بار ہا بولتی رہی، لکھتی رہی۔ہم نے خود کو کبھی بھی یہاں کی مزاحمتی تحریک سے الگ محسوس نہیں کیا۔اب جو بات مجھے بہت کھٹکتی ہے وہ بلوچستان میں اہل تشیع کی مسلسل کلنگ ہے۔ایک عرصے سے مسلسل انہیں نشانہ بنایا جا رہا ہے، اور ان کے حق میں کوئی مضبوط آواز نہیں آ رہی۔ مجھے اس پر بہت افسوس ہے۔پچھلے دنوں ہمارے دوست کمیل صاحب کے بھائی کو مارنے کی خبر آئی تو میں بے اختیار رو پڑی کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ان کے تمام پڑھے لکھے لوگوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔میری آپ دوستوں سے گزارش ہے کہ اس پر ضرور بولیں۔ادبی حلقے سے ان کے حق میں ضرور آواز آنی چاہیے''۔

فہمیدہ ریاض نے اپنی شاعری بھی سنا دی......۔اور وہ تب تک سناتی رہی، جب تک اس کی انگلیوں کے بیچ سگریٹ سلگتا رہا۔شاعری ہو رہی ہو تو دوسرے شاعر سے کہاں چپ بیٹھا جاتا ہے......سو اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی ڈاکٹر عظمیٰ قادری پھٹ پڑی۔اور بلوچستان میں ہر دوسرے دن برآمد ہونے والے نوجوانوں کی مسخ شدہ لاشوں پہ ایک نظم سنا ڈالی۔نظم کہاں تھی، دل کے پھپھولے تھے، جو پھوڑنے تھے......پھوڑ ڈالے۔ جاتے جاتے اس کے دوسرے پہلو میں بیٹھی دوسری شاعرہ جہاں آرا تبسم نے بھی اپنا حصہ 'لیا'، اور ایک نظم سنا ڈالی۔

محفل خوب رہی۔ہم نے مہمان کا شکریہ ادا کیا اور اسے رخصت کیا۔

پر ہمیں کیا پتہ تھا کہ پکچر ابھی اور چلے گی............

ہم جب اُسے واپس اس کے ہوٹل چھوڑنے گئے تو وہاں فہمیدہ رواں تبصرے کی صورت **سنگت پوہ زانت** کی محفل پہ اس قدر بولی کہ اُس کے ہم سفروں کے منہ میں پانی بھر آیا۔اور ان سب نے فرمائش کر ڈالی کہ انہیں بھی سنگت کے دوستوں سے مکالمے کا موقع فراہم کیا جائے۔

رات کے دس بجے سب دوستوں نے طے کیا کہ اگلے بارہ سے دو بجے بلوچی اکیڈمی میں چائے پہ جمع ہونا ہے۔یوں بلوچستان کے دانشوروں کا ایک نمائندہ اکٹھ ہو گیا، سبھی دانشور اور اہل

الرائے......میزبانی کی ذمہ داری عابد میر نے سنبھالی۔مہمانوں سے سبھی احباب کا تعارف کروایا۔

دوسری طرف سے فہمیدہ ریاض نے سبھی مہمانوں کا تعارف کروایا۔ان میں سب سے پہلے تھیں محترمہ خورشید حیدر، جس کے لیے ویسے تو 'ڈان والی' کا ٹیگ ہی کافی ہے، لیکن جب ایک ساتھی نے اس کے اضافی تعارف میں اسے اردو ادب کی نامور ناول نگار قراۃ العین حیدر کی بھتیجی بتایا تو سبھی حاضرین آنکھوں میں تجسس اور احترام اور بڑھا۔اس کے ساتھ، نوشابہ پروین تھی؛ معروف صحافی کی معروف صحافی بیوی۔اس کا شوہر 'آؤٹ لک' جیسے موقر جریدے کا بانی رہا۔اس کا نام ہم اکثر ویمن ایکٹووسٹ کے طور پر بھی سنتے رہے ہیں۔غازی صلاح الدین بھی موجود تھا......اس کے علاوہ وہاں امینہ سید تھی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی مینجنگ ڈائریکٹر۔زبیدہ مصطفیٰ بھی موجود تھی...... پاکستان میں علم و فکر کی معمولی سی شد و بد رکھنے والا بھی زبیدہ مصطفیٰ کے نام اور کام سے ناآشنا نہ ہو گا۔انگریزی کی صحافی، معروف تعلیم دان......عورتوں کی حقوق کی تحریک ہو یا عوام سے جڑی کوئی بھی تحریک، یہ اس کے ہراول دستے میں رہی ہے......۔اس کے ساتھ جو خاتون بیٹھی تھیں، اس کا چہرہ بھی ہمارے لیے نیا تھا اور نام بھی۔شاید اسی لیے اس نے اپنا تعارف خود کروانا پسند کیا۔اس نے بتایا کہ وہ بچوں کے لیے لکھتی ہے اور بچوں کی اَسی سے زائد کتب لکھ چکی ہے۔بچوں کا ایک ماہنامہ 'سنترہ' کے نام سے شائع کرتی ہے۔اس کا بنیادی خیال یہ ہے کہ بچوں کو بنیادی تعلیم ان کی مادری زبانوں میں ہی ملنی چاہیے۔

طے پایا کہ مہمانوں کو دس، پندرہ منٹ میں بلوچستان کی مجموعی صورت حال کا خلاصہ بتا دیا جائے، اس کے بعد وہ چاہیں تو سوالات کی صورت میں گفتگو آگے بڑھائیں یا اپنی آرا کا اظہار کریں۔یہ ذمہ داری شاہ محمد مری کے ذمے آئی۔

اس نے دوستوں کو بتایا کہ بلوچستان کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم پہ نعمتیں اتنی برسی ہیں کہ ہم سے سنبھالی نہیں جاتیں۔لوگ کم ہیں، آبادی کم ہے، وسائل بہت زیادہ ہیں۔اس لیے اب سب اس کو بچانے میں لگے ہوئے ہیں۔ہمسائے ہوں یا سات سمندر پار والے، سبھی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ہم سب پہ ذمہ داریاں بے شمار آ پڑی ہیں۔کل غازی صاحب بتا رہے تھے کہ کوئی ان سے کہہ رہا تھا کہ بلوچستان کے سو فیصد لوگ آزادی چاہتے ہیں، ہم شاید اتنی بڑی بات تو نہ کر سکیں لیکن یہ یقینی ہے کہ بلوچستان کے سو فیصد لوگ، اس جنگ کے متاثرہ ضرور ہیں۔کوئی گھر ایسا نہ ہوگا، جو بلواسطہ یا

بلاواسطہ اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔ دوسرا معاملہ یہ ہے کہ ذرا پیچھے چلیں تو بلوچستان کی وجہ سے ساری تاریخ بدل چکی ہے۔ مہرگڑھ سے گیارہ ہزار سالہ قدیم تہذیب کی دریافت کے بعد اب اس سارے خطے کی تاریخ کو نئے سرے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ وہ تہذیب تباہ نہیں ہوئی۔ یہ یہاں سے موہنجودڑو اور ہڑپہ کی جانب منتقل ہوگئی۔ یہاں سے پھل دریافت ہوئے ہیں، بیج دریافت ہوئے ہیں، جنہیں باقاعدہ بویا جاتا تھا، بیل گاڑی دریافت ہوئی ہے جو اب تک پٹ فیڈر کے علاقے میں لگ بھگ اسی صورت میں استعمال ہو رہی ہے، کشیدہ کاری کے نمونے ملے ہیں۔ سب سے بڑی دریافت، تحریر ملی ہے، جسے اب تک ڈی کوڈ نہیں کیا جا سکا۔ تو اتنی بڑی تہذیب کو سنبھالنا بھی از خود ایک مسئلہ ہے۔ ہمارے ہاں بلوچی میں سولہ کلاسیک داستانیں موجود ہیں، سولہ کلاسیک...... دنیا کی کسی بھی قدیم ترین زبان میں آپ کو اتنی تعداد میں کلاسیک نہیں ملے گا۔ ہم اس پر اُس طرح سے لکھ نہیں سکے جس طرح کہ لکھنا چاہیے تھا، اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

ایک بحران ہمارا سمندر ہے...... ایک ہزار میل پہ پھیلا ہوا۔ اس کے لیے ولندیزیوں سے لے کر انگریزوں سے لڑتے رہے ہیں۔ بہت کم بادشاہ خود ہاتھ میں تلوار لے کر لڑے ہوں گے۔ ہمارا قلات کا بادشاہ میر محراب خان انگریز سے دست بدست لڑتا ہوا مارا گیا۔ بلکہ ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ اس کا ایک ہندو دیوان وزیر تھا۔ وہ بھی جب لڑنے کو تیار ہوا تو خان نے اس سے کہا کہ تم ہماری رعایا ہو اور میں ایک کافر سے لڑنے جا رہا ہوں، تم کیسے اس سے لڑو گے، جس پر دیوان نے اس سے کہا اگر وطن کی خاطر لڑنے کے لیے کلمہ گو ہونا ضروری ہے تو لو میں کلمہ پڑھ کے مسلمان ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھا اور پھر خان کے ساتھ لڑتا ہوا شہید ہوا۔ بلوچ کے سیکولر مزاج کو جاننے کے لیے اسے ایک چھوٹی سی مثال سمجھ لیں۔ اس لیے یہ جو شیعہ سنی والا مسئلہ ہے، یہ کوئی ایشو ہے نہیں، بنا دیا گیا ہے۔ اور وہ بھی صرف شہروں کی حد تک۔ بلوچوں میں ہماری جو روایتی شاعری ہے، جسے نڑ پہ گایا جاتا ہے وہ رزمیہ ہو یا عشقیہ سیکڑوں مصرعوں پہ مشتمل ہوتی ہے، اس کا عمومی فارمیٹ یہ ہے کہ خواہ قصیدہ یا مرثیہ یا محبوب کے حسن و جمال کا بیان ہی کیوں نہ ہو، پہلے شاعر دو چار مصرعے خدا کی تعریف میں کہتا ہے، اسے آپ ہمارا احمد سمجھ لیں، پھر اسی طرح پیغمبر کی تعریف ہوتی ہے، یہ سمجھ لیں نعت ہوگئی، پھر خانوادۂ رسول میں سے کسی کی مدح ہوگی، حضرت علی یا حضرت حسین کا نام لے کر ان کی تعریف کی جائے گی اور پھر موضوع

کی طرف آیا جائے گا۔ اس لیے فرقہ واریت ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ چیزوں کو ڈائیلوٹ کرنے کا طریقہ ہے، اور یہ جس کے حق میں جا رہا ہے، ظاہر ہے وہی یہ کروا رہا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ سارے عالمی کھیل کا مرکز ہم بن گئے ہیں۔ پٹیرو ڈالر ہو یا پٹیرول...... اس 'پٹیرو' کے ساتھ جڑی جتنی تباہیاں ہیں، ان سب کا مرکز اب یہیں ہے۔ جب تک سوویت یونین تھا تب تک تو ہم بچے رہے۔ کہ کسی طرح طاقت کا توازن برقرار تھا۔ اب تو کھلی جارحیت ہے۔ عالمی سامراج کی طرف سے بھی اور ریاست کی طرف سے بھی۔ یہاں کی جمہوری تحریک بھی اب ظاہر ہے پہلے سے وسیع ہوگئی ہے۔

غازی صلاح الدین کا سوال تھا کہ کیا کسی باؤنڈری لائن کا تعین کیا گیا ہے؟ جیسے ایران اور بعض پشتون علاقوں پر بھی دعویٰ کیا جاتا ہے؟ ان کا معاملہ کیسے ہوگا؟۔

دوستوں نے بتایا کہ اس وقت جو برسرِ پیکار قوتیں ہیں وہ تو یہ کہتی ہیں کہ ایران میں بھی بلوچستان کا حصہ شامل ہے، افغانستان میں بھی ہے، اسی طرح جیکب آباد سے ملتان تک کے علاقہ پر دعویٰ ہے۔ لیکن یہ کوئی ایشو نہیں ہے، اس لیے کہ یہ باتیں ٹیبل پہ طے ہوتی ہیں۔ جب ایسا مرحلہ آئے گا تو اس کا بھی تعین ہو جائے گا۔ باقی جہاں تک پشتون علاقوں کی بات ہے تو اس پہ کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ دونوں فریقین اس پہ متفق ہیں کہ تم اپنے علاقے میں خوش، ہم اپنے علاقے میں خوش۔ اور ان کی باؤنڈری لائنز بہت واضح ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کو لے کر اصل ایشو سے توجہ نہ ہٹائی جائے۔

'ڈان والی' خورشید حیدر 'آنکھیں پھاڑ حیرت' سے کہنے لگی مجھے تو آپ لوگوں نے ڈرا دیا۔ یہ تو ایک اور بنگلہ دیش والی صورت حال ہے!

نوشابہ پروین صاحبہ نے یہ جاننا چاہا کہ بلوچستان میں خواتین کے حالات کیسے ہیں؟

احباب نے بتایا کہ ایسا بالکل نہیں ہے کہ بلوچستان میں خواتین کی حالت بہت اطمینان بخش ہے، اور 'سب اچھا ہے'۔ یہ مردانہ سوسائٹی ہے، عورتوں کے ساتھ استحصال بالکل موجود ہے، اور مسائل ہیں۔ عورت کے استحصال پہ پردہ پوشی کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ لیکن ان کا حل ہمیں اپنے اندر سے نکالنے دیں، باہر سے درآمد مت کریں۔ آپ ہمارے ساتھی رہیں، ہمارا ساتھ دیں۔ ہم پر اپنے طرز کی تبدیلی نہ تھونپیں۔ بلوچ آج بھی نیم قبائلی سماج میں رہتے ہیں، ان کے مسائل بھی وہیں ہیں، تو ان کا حل بھی وہیں سے ہوگا، قبائلی مسائل کا حل شہری انداز میں نہیں نکل سکے گا۔ دوسرا یہ کہ عورتوں کے حقوق کوئی مجرد

چیز نہیں ہیں، یہ مجموعی سماجی ڈھانچے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ مجموعی طور پر سماج بدلے گا تو عورتوں کی حالت بھی بدلے گی، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ عورتوں کے حقوق کی تحریک کو سماجی تبدیلی کی مجموعی تحریک سے جوڑ کر دیکھا جائے۔ یہ نہ ہو کہ مجموعی سماج کہیں اور جا رہا ہو اور ہم محض عورتوں کے حقوق کا بینر لیے کھڑے ہوں۔

تیسری بات اس ضمن میں یہ کہی گئی کہ کسی ایک جنونی انہونی واقعے کو پورے سماج پہ تھونپ دینا محض ایک طعنہ بازی ہے۔ نارمل بات کی جائے۔ ایسی بات جو پورے معاشرے میں چل رہی ہو۔ اگر ہر گاؤں اور ہر قبیلے میں کوئی بات رواج کی طرح موجود ہو تو اس کو لے کر کسی معاشرے کے بارے میں کوئی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔

مہمانوں کے وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے غازی صلاح الدین نے کہا کہ بلاشبہ یہ ہمارے لیے نہایت اہم گفتگو تھی۔ کیونکہ ہم تک چیزیں فلٹر ہو کے آتی ہیں۔ اسی لیے ہماری خواہش تھی کہ ہم آپ لوگوں سے براہِ راست مکالمہ کرسکیں۔ بلوچستان کے متعلق ہم بہت کچھ سنتے ہیں، پڑھتے ہیں، جانتے ہیں، لیکن اس محفل کے بعد ہم اسے ایک اور زاویے سے بھی دیکھنے کے قابل ہو گئے ہیں، جو ہم سے اوجھل تھا۔

دسمبر:

اس بار **سنگت پوہ و زانت** کا موضوع سٹڈی شیئرنگ تھا۔

کامریڈ کلیم نے بتایا کہ فی الوقت **سنگت** کا تازہ پرچہ اس کے زیر مطالعہ ہے، جسے ابھی اس نے مکمل نہیں کیا۔ پروفیسر ساجد بزدار نے بتایا کہ ان دنوں آغا گل کا ایک افسانوی مجموعہ ''پرندہ'' پڑھ کر ختم کیا ہے۔ اکیڈمی کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر منیر رئیسانی نے بتایا کہ گلزار کی تروینیوں پہ مشتمل کتاب ان دنوں اس کے زیر مطالعہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ کلیاتِ عطا شاد بھی ان دنوں زیر مطالعہ رہی۔ تیسری زیر مطالعہ کتاب دانیال طریر کا حال ہی میں شائع ہونے والا مجموعہ **معنی فانی** ہے۔ نوجوان شاعر ثنا ساغر نے بتایا کہ اس نے دانیال طریر اور جہاں آرا تبسم کے تازہ شعری مجموعے پڑھے ہیں۔ شیر دل غیب کا کہنا تھا کہ اس نے دانیال طریر کی **معنی فانی** اور ثنا ساغر کی ''وہ لال آنکھیں، سفید سایہ'' پڑھی ہے۔ عبداللہ دشتی نے کہا کہ وہ شیر دل غیب کا ناولٹ **تیرے فراق میں** پڑھ

رہا ہے۔

ہیبتان دشتی بتاتا ہے کہ اس نے کافی عرصہ بعد ایک کتاب، ایک ہی نشست میں پڑھ کر ختم کی اور یہ شیر دل کا ناولٹ **تیرے فراق میں** تھا۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری نے بتایا کہ تازہ تازہ جہاں آرا کی کتاب ''مجھے خطبہ نہیں آتا'' پڑھی ہے۔ دانیال کی شاعری بھی پڑھی، وہ بھی خوب ہے۔ باقی اس کی نثر کوشش کے باوجود مکمل نہیں کرسکا، ایک بار پھر کوشش کروں گا پڑھنے کی۔ تاریخ کی کتاب **تاریخ طبری** بھی ان دنوں پڑھتا رہا ہوں۔ حمید بلوچ نے **بلوچستان اینلز** کے نام سے پانچ ضخیم جلدوں میں جو کام کیا ہے، وہ بھی ان دنوں زیر مطالعہ رہا۔ شاہ لطیف پہ کام کر رہا تھا تو این میری شمل کی اُن سے متعلق کتاب پڑھی۔ **سٹیزن ٹام پین** پہ کام کر رہا تھا تو اس کے متعلق بھی پڑھتا رہا ہوں......

جہاں آرا تبسم نے بتایا کہ اجیت کور کی ایک کتاب **اندھا کاریز** ان کے زیر مطالعہ ہے۔

نورین لہڑی نے یہ نقطہ اٹھایا کہ آج کل الیکٹرانک میڈیا بھی سیکھنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے، اس لیے اگر اسے بھی سٹڈی سرکل یا شیئرنگ کا حصہ بنایا جائے تو بہتر ہوگا۔

پروین ناز نے کہا کہ **تیرے فراق میں** اور **معنی فانی** اس کے زیر مطالعہ ہیں۔ لیکن اپنی سماجی مصروفیات کے باعث وہ اب تک انہیں توجہ سے پڑھ نہیں سکی، اور دونوں کتابیں یہ مطالبہ کرتی ہیں کہ انہیں سکون سے پڑھا جائے۔

دانیال طریر نے بتایا کہ سعید مستوئی کی ''خواب سلامت رہیں'' اس کے زیر مطالعہ رہی ہے۔ دوسری کتاب شیر دل غیب کا ناولٹ **تیرے فراق میں** پڑھا۔

نوید لانگو نے بتایا کہ اس نے خیام ثنا کی **وہ لال آنکھیں سفید سایہ** پڑھی ہے۔

ڈاکٹر عطا اللہ بزنجو نے بتایا کہ اس نے سعید مستوئی کی ''خواب سلامت رہیں'' پڑھی ہے۔ اس کے علاوہ جہاں آرا تبسم کی کتاب **مجھے خطبہ نہیں آتا**، پڑھ رہا ہوں۔

سال 2013

جنوری:

(1)

سنگت اکیڈمی اسلام آباد شاخ کا قیام

ایک طویل عرصے تک سنگت اکیڈمی کے دوست اس شش و پنج میں پڑے رہے کہ اس کی شاخیں قائم کریں یا نہیں۔ بلوچی میں کہتے ہیں بازیں مڑدانی دیز نہ گرزی (بہت سے آدمیوں کا دیگ کچا رہتا ہے)۔ چنانچہ ہمارا دیگ بھی عرصے سے بے گلا رہا۔ علی کمیل قزلباش نے ہمارا شش و پنج تو ڑ ڈالا۔ اسلام آباد میں اس کی شاخ قائم کی۔ اور پھر ہمیں خبر کردی۔ یار تو آپ کے فیصلے بدل ڈالتے ہیں۔ اور بلوچستان میں یار فیصلوں کو 180 ڈگری میں بھی بدل ڈالنے کی مان رکھتے ہیں۔ قزلباش اچھا یار ہے کہ اس نے ہم پچاس افراد کا فیصلہ بدل کر کے رکھ دیا۔ پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد کے دفتر میں سنگت اکیڈمی (اسلام آباد) کا اجلاس منعقد ہوا۔ اتفاقِ رائے سے عہدیداروں اور مجلسِ عاملہ کے اراکین کا انتخاب کیا گیا۔

۱۔ ڈاکٹر عبداللہ جان عابد	جنرل سیکریٹری
۲۔ ڈاکٹر علی کمیل قزلباش	ڈپٹی سیکریٹری
۳۔ یوسفین احمد	پریس سیکریٹری
۴۔ حاکم علی برڑو	خازن

ڈاکٹر عبدالواحد تبسم، ضیاءالرّحمان بلوچ، فیصل ریحان اور طارق الیاس مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔

کابینہ کی تشکیل کے بعد پوہ و زانت کی نشست ہوئی جس میں ڈاکٹر عبداللہ جان عابد نے پشتو غزل سنائی۔ ڈاکٹر عبداللہ جان عابد نے ہی اپنا پُر مغز تنقیدی مضمون ''ہاشم بابر کا شعری اُفق'' پیش کیا۔

(2)

20 جنوری 2013 سنگت کی **مرکزی کمیٹی** کا اجلاس ہوا۔

سیکریٹری جنرل نے سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ جس میں اکیڈمی کے زیر اہتمام گزشتہ برس ہونے والی سرگرمیوں کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا۔ ان میں مرکزی تقریب بیادِ سائیں کمال خان سمیت، ہر ماہ ہونے والی پوہ و زانت کی نشستوں کا بھی حوالہ دیا گیا۔ نیز سائیں کمال خان سے متعلق شائع

ہونے والی کتاب کی صورت حال بھی بتائی گئی۔

مالی امور کی صورت حال سے متعلق سیکریٹری جنرل نے بتایا کہ اس وقت اکیڈمی کے اکاؤنٹ میں اکیس ہزار روپے کی رقم موجود ہے، جبکہ اُنتیس ہزار سائیں کمال خان کی کتاب پر خرچ کیے گئے تھے۔

اس بات پر اتفاق تھا کہ بلوچستان کی دیگر فعال و ہم خیال ادبی تنظیموں کے ساتھ فوری رابطہ کاری کی جائے۔ اور انہیں اپنی تقریبات میں شمولیت کے لیے باضابطہ تنظیمی سطح پر دعوت دی جائے۔

اس وقت اکیڈمی کی دو کتابیں اشاعت کے لیے تیار ہیں۔ ایک عبداللہ جان جمالدینی کی **لٹ خانہ** اور دوسری ڈاکٹر شاہ محمد مری کی **سنگت ادبی تحریک**۔

آخر میں حال ہی میں وفات پا جانے والے معروف ادیبوں انوار احسن صدیقی، محمد علی صدیقی اور ثمینہ راجہ کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

نیز کوئٹہ میں ہونے والے بم دھماکوں میں بے گناہ افراد بالخصوص صحافیوں کی اموات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس عمل کی شدت سے مذمت بھی کی گئی۔

(3)

جنوری 2013 کے **سنگت پوہ و زانت** کی نشست اندرونِ بلوچستان، بالخصوص کیچ سے آئے ہوئے بلوچی کے نوجوان شاعروں کے اعزاز میں رکھی گئی۔ نشست کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے حصے میں شعری نشست کا سلسلہ رکھا گیا جبکہ دوسرے حصے میں کیچ کے دوستوں سے وہاں کی ادبی صورت حال پر بحث و مباحثہ رکھا گیا۔

نشست کے آغاز میں سنگت اکیڈمی کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر منیر رئیسانی نے تمام مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور انہیں سنگت کی سرگرمیوں سے متعلق مختصراً آگاہی دی۔

اس کے بعد شعری نشست کا آغاز کیا گیا۔ نوجوان شاعر ظہور عصا نے بلوچی میں موجودہ سیاسی منظر نامے کی عکاسی کرتی ہوئی ایک خوبصورت نظم سنائی اور داد سمیٹی۔ اس کے بعد خیام ثنا نے حال ہی میں شائع ہوئی اپنی کتاب 'وہ لال آنکھیں، سفید سایۂ سے ایک طویل نظم سنائی۔ کیچ کے قدیر قاضی نے بہت سلیس بلوچی میں خوبصورت شاعری سنائی۔ نہایت رواں اور شستہ و شائستہ شاعری۔ حمل امین

دشتی نے پہلے اردو میں ایک مضمون نما افسانچہ سنایا اور پھر قمری کی صدا، کوکو کی ردیف پر ایک اردو غزل بھی سنائی۔ علاوہ ازیں اس نے اپنی بلوچی نظم بھی سنائی۔

اس کے بعد یونس واہگ آیا تو اس نے بھی آغاز اردو اشعار سے کیا۔ اردو میں ہی ایک نظم سنائی۔ بلوچی میں بھی اس نے سنایا۔ اخوان ارمان نے بھی پہلے اردو غزل اور نظم سنائی اور پھر بلوچی شاعری۔ آدم نجیب نے ایک مختصر غزل سنانے پر اکتفا کیا۔ تو اس کے بعد آنے والے ناصر نے ایک کے بعد دوسری، تیسری، اور چوتھی غزل سنا ڈالی۔

ضیا شفیع نے اپنی بلوچی غزل میں اندھوں کے شہر میں آئینے بیچنے کی دُہائی دی۔ شریف قاضی نے ماہیکان کی ردیف پر ایک خوبصورت غزل سنائی۔ عبداللہ دشتی نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ ظریف زدگ نے اپنے مختصر کلام میں ہم عصر بلوچی شاعری کا حق ادا کیا۔

پھر سنگت اکیڈمی کے ساجد بزدار صاحب نے شاعر اللہ بشک بزدار کا کلام سنایا۔ سعید کرد نے براہوی میں شاعری سنائی۔ جہاں آرا تبسم نے بھی آغاز براہوی کے دو اشعار سے کیا اور پھر اردو کی جانب آئی۔

دانیال طریر سے اردو سمیت پشتو کی نمائندگی کی بھی فرمائش ہوئی، جسے اس نے خوب نبھایا۔ پھر سعید کرد نے سلیس براہوی میں چند اشعار سنائے۔ ڈاکٹر منیر رئیسانی کے اختتامیہ کلمات اور اشعار پر اس نشست کا اختتام ہوا۔ اس نے بھی آغاز براہوی نظم سے کیا، چاکر اور شہ مرید کے قصے کے پس منظر میں ایک نفیس خیال کے ساتھ لکھی گئی نظم۔ اور پھر اردو غزل سنا کر نشست کے شعری حصے کو اختتام پذیر کیا۔

آخر میں کیچ سے آئے ہوئے دوستوں سے وہاں کیا دبی صورت حال پہ بات چیت ہوئی۔ نیز وہاں قائم کرنے والے ادبی اداروں اور سنگت کے باہمی روابط کے فروغ پر بھی بات ہوئی۔

مارچ:

سنگت اکیڈمی اسلام آباد کی ماہانہ **پوہ زانت** کا انعقاد سیکریٹری عبداللہ جان عابد کی صدارت میں ہوا جس میں نظامت ڈپٹی سیکرٹری ڈاکٹر علی کمیل قزلباش نے کی۔ حاکم علی برڑو نے ''سندھی ادب کا معاصر منظر نامہ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ جس میں سندھی ادب کے پس

منظر اور سندھ میں وڈیرہ شاہی اور اس کے مضمر اثرات کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اور اس پس منظر میں سندھی ادب کی شاعری، افسانہ، ناول، ڈرامہ اور لوک ادب پر اجمالی نگاہ ڈالتے ہوئے، سندھی ادبی بورڈ اور دیگر علمی اداروں کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ جس میں روشن فکر ادب اور اس کے عروج کو خصوصی طور پر موضوع بنایا گیا۔

اس کے بعد فیصل گوندل نے اپنا افسانہ ''ایک لاپتہ کردار کی گمشدہ کہانی'' پیش کیا۔

اپریل:

اس ماہ سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے اجلاس کا پہلا حصہ **پوہ و زانت**، دوسرا **جنرل باڈی** اجلاس پر مشتمل تھا۔ پوہ و زانت میں تنقیدی نشست کی صدارت پروفیسر نصر اللہ وزیر نے کی۔

شعری حصے میں ڈاکٹر منیر رئیسانی نے 'دراوڑ' کے عنوان سے اپنی نظم پیش کی۔ جس پہ تفصیلی گفتگو کی گئی۔ نثری حصے میں فیصل ندیم نے اپنا افسانہ 'ابلیس کا وضو' پڑھا۔

جنرل باڈی اجلاس کے ایجنڈے میں ہم فکر تنظیموں سے روابط، سنگت اکیڈمی کی مزید شاخوں کا قیام، سالانہ چندہ و مالی امور اور کتابوں کی اشاعت کے معاملات شامل تھے۔

تفصیلی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ سنگت اکیڈمی کی تنظیم سازی کو وسعت دی جائے لیکن اس بابت جلد بازی اختیار نہ کی جائے۔ نیز ایک متفقہ قرارداد میں اسلام آباد میں سنگت اکیڈمی کو فعال بنانے پر وہاں کے دوستوں بالخصوص ڈاکٹر علی کمیل قزلباش کی کاوشوں کو سراہا گیا۔

کتابوں کی اشاعت سے متعلق دوستوں نے طے کیا کہ **لٹ خانہ** اس وقت تیار ہے، اسے فوری طور پر شائع ہونا چاہیے۔ اور اگر ممکن ہو تو سنگت اکیڈمی خود شائع کرے۔ اس کے بعد **سنگت ادبی تحریک** کی اشاعت پر بھی غور کیا جائے۔

مئی:

سنگت پوہ و زانت کی ماہانہ تنقیدی نشست طے شدہ پروگرام کے مطابق 19 مئی 2013 کی شام پروفیشنل اکیڈمی میں منعقد ہوئی۔ اس نشست کے شرکا تھے؛ ڈاکٹر منیر رئیسانی، شاہ محمد مری، جاوید اختر، جیئند خان، بیرم غوری، ڈاکٹر غلام محمد کھیتران، کامریڈ کلیم، عابد میر، گہرام اسلم،

خیام ثنا، نوید لانگو، زبیر بلوچ۔ نشست کی صدارت سنگت کی مرکزی کمیٹی کے رکن نامور استاد اور ماہر لسانیات پروفیسر جاوید اختر نے کی۔

نشست کا آغاز، حال ہی میں رحلت کر جانے والے بلوچستان کے نامور شاعر عین سلام سے متعلق گفت گو سے کیا گیا۔ ان کی شخصیت پر پہلے ڈاکٹر منیر رئیسانی اور پھر پروفیسر بیرم غوری نے مختصر گفتگو کی۔ نیز ان کے حق میں دعا بھی کی گئی۔

کلا خان نے ''موروثی سیاست اور کارکنوں کی محنتِ رائیگاں'' کے عنوان سے پڑھا۔ عابد میر نے 'علم اور عقیدے میں گھری کہانی' کے عنوان سے کہانی پیش کی۔ خیام ثنا نے بلوچی اور اردو کا کلام سنایا۔ تمام تحریروں پہ سیر حاصل گفت گو ہوئی۔

اگست:

ماہ اگست کے سلسلے میں پوہ و زانت کی نشست کا اہتمام پروفیشنل اکیڈمی میں ہوا۔ نشست کے شرکا میں شامل تھے؛ ڈاکٹر منیر رئیسانی، شاہ محمد مری، پروفیسر جاوید اختر، جیئند خان جمالدینی، افضل مراد، ڈاکٹر عطااللہ بزنجو، سنگت رفیق، کامریڈ کلیم، قلا خان، جہاں آرا تبسم، خیام ثنا، عابد میر۔

''چین کے نئے ابھرتے سامراجی کردار'' سے متعلق گفتگو اِجنڈے پہ تھی۔ ادبی حصے میں افضل مراد کی براہوی نظموں کے جہاں آرا کے منتخب تراجم اور اکیڈمی کی کارکردگی سے متعلق بحث۔ سیکریٹری جنرل کی سربراہی میں نشست کا آغاز ہوا۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری نے اپنے مضمون میں کہا کہ چین کو ایک زمانے میں ہم نے جس طرح دیکھا تھا، وہ موجودہ عہد سے یکسر مختلف پس منظر تھا۔ پھر سوویت یونین چلا گیا تو چین کو شاید احساس ہوا کہ اب ایسے نہیں چلے گا۔ طریقہ کار بدلنا ہوگا۔ انہوں نے خوب انڈسٹری لگائی۔ شروع میں اس پہ خود ملک کے اندر بھی تنقید ہوئی کہ اتنی زیادہ انڈسٹری سے ماحول کو خطرہ ہے، زراعت کا کیا ہوگا، کسان کہاں جائے گا، وغیرہ۔ مجھے یاد ہے ان کے ایک لیڈر نے کہا تھا خود پہ دنیا کی کھڑکی کھولو گے تو اس کی تمام تر فضا کے ساتھ اس کے مچھر اور مکھیاں بھی اندر آئیں گی۔

خیر وہ تو اُس وقت کے معاملات تھے، جب یہ مسائل چین کی سرحدوں کے اندر تک محدود

تھے، لیکن پچھلی دو دہائیوں سے اب یہ معاملات عالمی دنیا کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ اب یہ بلواسطہ یا بلا واسطہ ہمیں اور آپ کو متاثر کر رہا ہے۔ لیکن نظریاتی محاذ کے لوگوں نے ابھی تک اس پہ اُس طرح کھل کے بحث نہیں کی۔ کہیں مصلحت آمیز خاموشی ہے، کہیں نظریاتی معاملات ہیں۔ جو کچھ بھی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اب چین سے متعلق ہمیں اپنے خیالات پہ ایک بار نظر ثانی کر لینی چاہیے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ یہ دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن چکا ہے، بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ امریکی معیشت بھی بلواسطہ طور پر اس کی محتاج ہے اس لیے پہلی بڑی معیشت یہی ہے۔

ہم ساٹھ برسوں سے سنتے آ رہے ہیں پاک چین دوستی ہمالیہ سے بلند اور سمندر سے گہری ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ آخر اس دوستی کی بنیاد کیا ہے۔ نہ تو پاکستان، چین کا نظریاتی اتحادی ہے، نہ تہذیبی دوست ہے، نہ دونوں میں کوئی ثقافتی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں سرمایہ دار ملک ہیں اور سرمایہ دار ملکوں کے تعلقات مفادات کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ محض بھارت دشمنی پہ اسے دیرپا نہیں رکھا جا سکتا۔

میرا خیال ہے کہ چین چھ طریقوں سے ہم پہ اثرات ڈال رہا ہے: سستا خام مال لے جاتا ہے، اسی سے سامان سے تیار کر کے ہمیں بیچتا ہے، اپنا اسلحہ ہم پہ فروخت کرتا ہے۔ چوتھا یہ کہ یہ گوادر ہم سے نہایت خفیہ اور بھونڈے طریقے سے لے گیا، پانچواں یہ کہ چین گڈانی کے مقام پہ بجلی پیدا کرنے کے لیے کوئلے کا پلانٹ لگائے گا۔ جو ایک اور تباہی ہے۔ چھٹا گوادر قراقرام کا معاملہ ہے۔ یہ محض ایک شاہراہ کا معاملہ نہیں ہے۔ اس شاہراہ سے وہ اپنا سامان لائے گا، یہاں سے پھر یہ وسطی ایشیا اور افریقہ تک جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے پوری ڈیموگرافی متاثر ہوگی۔ کوئلے کے پلانٹ والا معاملہ نہایت خطرناک ہے، ایک تو اس سے جو آلودگی پھیلتی ہے، اس کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔ فضا الگ سے آلودہ، پھر اس سے بے تحاشہ پانی خارج ہوتا ہے جو سمندر میں جا گرتا ہے، یعنی سمندر بھی آلودہ۔ اس میں ایک ڈرامہ یہ بھی ہے کہ اس سے جو بجلی پیدا ہوگی وہ بھی ہمیں نہیں ملے گی بلکہ یہاں سے نیشنل گریڈ کو جائے گی، وہاں سے پھر وفاق اسے اپنی مرضی سے تقسیم کرے گا۔

ڈاکٹر مری نے کہا کہ میں ایک آخری نقطہ بیان کر دوں، پھر آپ دوست اس پہ مزید بحث کر سکتے ہیں۔ شروع میں جب چین یہاں آ رہا تھا تو ہمارا خیال تھا کہ ڈیپ سی پورٹ بن رہا ہے تو بہت بڑا

پراجیکٹ ہے، مقامی لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے۔ میں نے وہاں کے ایک دوست سے معلوم کیا تو اس نے کہا جناب کوئی مزدور نہیں لگا، جو کام پہلے کئی مزدور مل کر کرتے تھے، اب وہ کام بھی مشین کے ذریعے ایک آدمی کرتا ہے۔ پھر لطیفہ اس نے یہ سنایا کہ ہمارا خیال تھا چینی کتے وغیرہ شوق سے کھاتے ہیں تو ہم نے سوچا شاید ہمارے کتے ہی بک جائیں۔ پہلے دو چار ہفتے تو یہ کام چلا، لیکن پھر چینیوں نے دیکھا کہ بلوچ کا تو کتا بھی لاغر ہے، انہوں نے پھر پشین سے بڑے موٹے تازے کتے منگوانا شروع کر دیے، یعنی مزدوری تو کیا ملنی تھی، چین کے ہاتھوں بلوچ کا کتا بھی نہ بک سکا۔

اس پہ جیئند خان نے کہا کہ وہاں کا ماہی گیر تو اب ڈیزل سمگل کر کے اپنا گزارہ کر رہا ہے۔ وہ تو اپنے کام سے بھی گیا۔

قلا خان نے کہا کہ گوادر کے پانی سے متعلق میں نے پڑھا تھا کہ اسے ہیوی واٹر کہتے ہیں، جو ایٹمی حوالے سے اہم ہوتا ہے، اس لیے اس پر بھی نظر ہے۔ پھر اس کے فعال ہونے کی صورت میں دبئی کا بڑا پورٹ ناکام ہو سکتا ہے، اس لیے عرب بھی اسے کامیاب نہیں دیکھنا چاہتے۔

ڈاکٹر مری نے کہا کہ اس سے صرف دبئی کو نہیں بلکہ ایرانی بلوچستان کا چاہ بہار بھی ناکام ہونے کا خطرہ ہے۔ اس لیے ایران اپنے چاہ بہار پورٹ کو بڑے پیمانے پر ڈویلپ کر رہا ہے۔ ایران دشمن قوتیں پھر اسے کامیاب کرنے کے چکر میں ہیں۔ اس لیے یہ اب عالمی طاقتوں کی رسہ کشی کا محور بن گیا ہے۔

جاوید اختر نے کہا کہ یہ بحث سوشلسٹ گروہوں میں پہلے بھی ہوئی تھی جس میں بعض نے کہا تھا کہ آگے چل کر چین اور امریکہ کا تضاد ابھرے گا اور دونوں مارکیٹ کے معاملے پہ آمنے سامنے ہو جائیں گے، جب کہ بعض نے اُس وقت بھی کہا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا، دونوں کا اتحاد ہو جائے گا، دونوں کاروباری ہیں، مل کر کاروبار کریں گے۔

سنگت رفیق نے کہا کہ چین کے اس کردار پر بلوچ تو بہت پہلے سے کلیئر ہے۔ جس پہ ڈاکٹر مری نے کہا کہ بالکل درست، لیکن ہم جو سفید بالوں والے لوگ ہیں، جنہوں نے اپنی جوانی چین کے سرخ کردار کو دیکھتے ہوئے بسر کر دی، ہمارے قائدین ماؤ کے بیج اپنے سینے پہ لگائے رہے، ہمیں چین سے متعلق اب تک یہ وہم تھا کہ وہ تو کمیونسٹ پارٹی کا ملک ہے، وہ کیسے ایسا کر سکتا ہے، میں اُس کی

بات کر رہا ہوں۔ بلوچستان میں ترقی پسند قوتوں کا یہ شاید واحد فورم ہے جو چین سے متعلق نرم گوشہ رکھتا تھا، جسے اب اس پہ نظر ثانی کرنے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔

ڈاکٹر عطا اللہ نے کہا کہ یہ کوئلے کے پلانٹ والی نئی بات ہے، لوگوں کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ دنیا بھر میں کوئلے کے پلانٹ بند ہو رہے ہیں، اور یہاں ابھی یہ تجربہ ہونے جا رہا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ ایسے میں ہمارا کردار کیا ہونا چاہیے۔

کامریڈ کلیم نے کہا کہ تیل کا معاملہ بھی اہم ہے، چین اور امریکہ کو اس کی بھی شدید ضرورت ہے، اس لیے وہ یہاں ہر صورت میں آئے گا۔

عابد میر نے کہا کہ یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ امریکہ پہلے ہی سامراج تھا، چین بھی سامراج بن گیا، اور دونوں خطے میں موجود ہیں، تو پھر آپ کے اور ہمارے پاس چوائس کیا رہ جاتی ہے؟

ڈاکٹر مری نے کہا کہ حکمت عملی کا سوال تو بعد کا ہے، پہلے تو اس پہ ہمیں واضح ہونا چاہیے کہ چین اب پہلے والا چین نہیں رہا، اس کا کردار اب سامراجی ہوتا جا رہا ہے، یا ہو چکا ہے۔ باقی رہی ہماری بات !۔ تو وہ یہ ہے کہ ہم سامراج مخالف ہیں، سامراج مخالف رہیں گے، جو بھی اِس صف میں شامل ہوتا جائے گا ہماری مخالفت کا ہدف بنتا جائے گا۔

نشست کے دوسرے حصے میں افضل مراد کی چند براہوی نظموں کے تراجم، جہاں آرا نے پیش کیے۔

نظموں پہ بات کرتے ہوئے ڈاکٹر منیر رئیسانی نے کہا کہ تراجم کی صنف کچھ واضح نہ تھی، کہیں آزاد نظم کی فارم تھی، کہیں نثری نظم کی۔ یہ اگر واضح کر دیا جاتا تو سننے اور سمجھنے میں ذرا سہولت رہتی۔ اِن تراجم پہ بڑی دیر تک گفتگو ہوئی رہی۔

نشست کے آخری حصے میں سیکریٹری جنرل نے گذشتہ ماہ ایگزیکٹو باڈی کے ہونے والے اجلاس کی کارروائی اور اہم فیصلوں سے دوستوں کو آگاہ کیا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ عبداللہ جان جمالدینی کی کتاب **لٹ خانہ** شائع ہو چکی اور سنگت کے اپنے دوست اس کی فروخت میں لگے ہوئے ہیں۔ نومبر میں اکیڈمی کی مرکزی کابینہ کے انتخابات کے معاملات پر بھی تفصیلی گفتگو ہوئی۔

اوستہ محمد شاخ

عابد میر نے بتایا کہ اکیڈمی کی اندرونِ بلوچستان تنظیم سازی کے معاملے میں اوستہ محمد میں سنگت کی شاخ قائم کردی گئی ہے۔ دسمبر تک عبوری کابینہ تشکیل دی گئی ہے۔ اس عبوری کابینہ کے سیکریٹری جنرل ظفر زہری، ڈپٹی سیکریٹری وحید تبسم اور پوہ و زانت کے انچارج عبدالرشید موم مقرر ہوئے۔ غلام رسول آزاد، اسرار شاکر، خالد میر، صاحب خان جمالی، غلام دستگیر رند ایگزیکٹو ممبران بنے۔

ستمبر:

سنگت پوہ و زانت کی ماہ ستمبر کی نشست کا انعقاد 22 ستمبر 2013، بروز اتوار کی شام پروفیشنل اکیڈمی میں ہوا۔ اس نشست کے شرکا تھے: ڈاکٹر منیر رئیسانی، ڈاکٹر نصراللہ وزیر، پروفیسر جاوید اختر، ساجد نبی بزدار، ڈاکٹر عطااللہ بزنجو، سعید کرد، جوہر بنگلزئی، کامریڈ کلیم، قلا خان خروٹی، خیام ثنا اور عابد میر۔ علاوہ ازیں نشست میں اسلام آباد سے آئے ہوئے دو مہمان پروفیسر بھی شریک ہوئے۔ جن میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ پاکستانی زبانیں سے وابستہ ضیا بلوچ، اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز کے شعبہ بلوچی سے طارق رحیم شامل تھے۔

ایجنڈہ یہ تھا: خیام ثنا کا افسانہ، سید خان بزدار کی بلوچی شاعری اور فیض صاحب کی نظم پہ گفت گو۔

خیام ثنا نے 'کورٹ میرج' کے عنوان سے افسانہ پیش کیا۔

افسانے پہ گفت گو کا آغاز کرتے ہوئے ساجد بزدار نے کہا کہ میں کیونکہ خود بھی بلوچی میں افسانے لکھتا ہوں، اس لیے میں افسانے کی تکنیک کے حوالے سے بات کروں گا۔ اس میں موضوع کی بھی اہمیت ہے۔ جس موضوع پہ یہ افسانہ لکھا گیا ہے، جسم فروشی، کسی پہ دل آجانا اور پھر اس کے طوائف ہونے کے انکشاف پہ غیرت میں آکر قتل کر دینا، ان پہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

ڈاکٹر نصراللہ وزیر نے کہا کہ افسانے کی زبان کچھ غیر مانوس سی ہے، جس کے باعث افسانے کا ماحول اور پس منظر واضح نہیں ہوتا۔ اس لیے مجھ پہ یہ افسانہ کچھ کھلا نہیں۔

ڈاکٹر عطااللہ بزنجو نے کہا کہ واقعات کو آپس میں گڈ مڈ کر دیا گیا ہے اور کہانی اچانک غیر متوقع طور پر اختتام پزیر ہو جاتی ہے۔

سعید کرد نے کہا کہ مرکزی کردار نازیہ کو آخر میں مرنا نہیں چاہیے تھا۔ اختتام کچھ اور بھی ہو

سکتا تھا۔

پروفیسر جاوید اختر نے کہا کہ لگتا ہے افسانہ جلد بازی میں لکھا گیا ہے اس لیے اس میں کئی کمیاں رہ گئی ہیں، جیسے زمان و مکان کا ذکر نہیں، جس سے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کہانی کب کی ہے اور کہاں کی ہے۔ کردار پوری طرح سے ڈویلپ نہیں ہوئے۔ ان کا سماجی پس منظر واضح ہوتا ہے، نہ ہی ان کی ذہنی سطح کا اندازہ ہوتا ہے۔ جیسے وہ کہانی کے شروع میں ہیں، آخر تک ویسے ہی رہتے ہیں۔ نیز ان کا مکمل طور تعارف بھی نہیں کروایا گیا۔ ان کی ٹریٹمنٹ پر توجہ نہیں دی گئی۔ منظر کشی بالکل نہیں ہے، جس سے افسانویت کا تاثر ہی نہیں ابھرتا۔ ایک سپاٹ سی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر منیر رئیسانی نے کہا کہ پہلے صفحے سے تو یوں لگا کہ جیسے کوئی منفرد چیز ہوگی۔ لیکن آگے جا کر کہانی روایتی سی ہوگئی۔ اس موضوع پہ واقعی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس لیے اس پہ لکھتے ہوئے یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ اتنے سارے لوگوں کے لکھنے کے بعد آپ اس موضوع پر کیا نیا رخ پیش کر پاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مجموعی طور پر اسے مناسب افسانہ کہا جا سکتا ہے۔

کامریڈ کلیم نے کہا کہ اپنی بنیادی زبان سے ہٹ کر کسی دوسری زبان میں لکھنا ویسے بھی مشکل کام ہے، اس لحاظ سے تو یہ ایک اچھی کوشش ہے۔

عابد میر نے کہا کہ تکنیکی طور پر ایک کمزور افسانہ ہے۔ کہانی کا اختتام ایک دم سپاٹ اور بے ڈھنگا معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں عمومی طور پر پوری کہانی اور بالخصوص اختتام مصنف کی نظر ثانی کے متقاضی ہیں۔

مہمان ساتھیوں میں سے طارق رحیم نے کہا کہ یہ بات سہی ہے کہ افسانے کا انداز شروع میں کسی نظم کا سا لگتا ہے۔ موضوع بہت زیادہ گھسا پٹا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں۔ نوآمیز لکھاری کے بطور اسے اچھی کوشش کہا جا سکتا ہے۔

ضیا بلوچ نے ایک باریک نقطے کی جانب توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ اس میں طوائف کے تذکرے میں کہا گیا ہے کہ اسے ایک 'افغانی برقعے' میں پیش کیا گیا، حالانکہ برقعہ بذاتِ خود بات کا مکمل مفہوم دے رہا ہے، اس میں افغانی برقعہ کہنا کچھ معیوب سا لگتا ہے۔

اس مباحثے کے بعد صاحبِ افسانہ کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو اس نے کہا کہ جہاں

تک موضوع کی بات تو ہے تو میں کچھ بھی طے کر کے نہیں لکھتا، بس جو موضوع روح کو چھو جائے، اسی پہ لکھتا ہوں۔ آج کی نشست سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ کچھ غلطیوں کا احساس ہوا۔ میں کوشش کروں گا کہ اس میں بہتری آئے۔

اس کے بعد جناب ساجد بزدار نے سیذ خان کی بلوچی شاعری میں سے کچھ منتخب ٹکڑے مفہوم کی وضاحت کے ساتھ سنائے۔ شاعر کا تعارف کرواتے ہوئے اس نے بتایا کہ سید خان بلوچی کے سلیمانی لہجے کا عمر رسیدہ شاعر ہے۔ بلوچی شاعری کی ایک صنف دستانغ ہے۔ اس نے سو کے قریب دستانغ لکھے ہیں، اور ہر دستانغ دو سو سے زائد اشعار پہ مشتمل ہے۔ میں نے کتابی صورت میں انہیں مرتب کیا ہے، جس کی اشاعت جلد سنگت اکیڈمی کے زیر اہتمام ہوگی۔ ان میں سے میں نے ایک دستانغ منتخب کیا ہے جس میں دل اور جسم کا مکالمہ ہے۔ اس میں دل روح کی اور جسم عقل کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کی ایک خوبصورت بات یہ ہے کہ اس میں مشرقی بلوچی کے بعض ایسے الفاظ اور محاورات استعمال ہوئے ہیں، جن کا مفہوم، وہاں عمر بتانے والے ہم جیسے لوگوں کو بھی نہیں معلوم، یعنی وہ اس قدر قدیم اور خالص الفاظ ہیں۔ یوں اس نے اپنے ڈکشن کے ذریعے زبان کے قدیم ذخیرے کو محفوظ کیا ہے۔

اس کے بعد اس نے دستانغ کے کچھ منتخب اشعار سنائے، جس سے حاضرین محظوظ ہوئے۔

آخر میں فیضؔ کی نظم ''اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے'' ڈاکٹر منیر رئیسانی نے پڑھ کر سنائی۔

نظم پر رائے دیتے ہوئے ساجد بزدار نے کہا کہ فیض صاحب کو پڑھ کے مجھے ہمیشہ ایک ہی احساس ہوا ہے کہ انسان کسی صورت موت سے، ڈر سے، خوف سے، تاریکی سے شکست نہیں کھا سکتا۔

خیام ثنا نے کہا کہ حالانکہ فیض صاحب نے یہ نظم آج سے تیس سال پہلے لکھی ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے آج کی عکاسی کی گئی ہو۔

قلا خان نے کہا کہ فیض صاحب ہمارے عہد کے کلاسک ہیں۔ ان کی یہ نظم بلاشبہ ہر دور کی ترجمان ہے۔

جوہر بنگل زئی نے کہا کہ عام طور پر کسی بڑے شاعر کا اچھا خیال دیکھ کر ہمارے شاعر دوست کوشش کرتے ہیں کہ اسی خیال میں کچھ لکھیں اور وہ یہ کہتے بھی ہیں کہ اس خیال میں تو وہ بھی لکھ سکتے ہیں، لیکن فیض صاحب کی یہ نظم پڑھ کے وہ بھی یہی کہیں گے کہ اس خیال کو اس طرح باندھنا آسان

نہیں۔ فیض صاحب کی ہمسری واقعی ممکن نہیں۔

پروفیسر جاوید اختر نے کہا کہ کیا کیا جائے؟ یہ وہ خیال ہے جو ہر دور کے فرد کو پریشان کرتا رہا ہے۔ چرنی شوفسکی نے اپنے ایک ناول میں اس کا جواب دیا ہے۔ جس کا لینن نے بہت زیادہ حوالہ دیا ہے۔ ادیب کیونکہ اپنے سماج کا ضمیر ہوتے ہیں، اس لیے وہ صرف یہ سوال نہیں کرتے بلکہ اس کا جواب بھی تلاش کرتے ہیں۔ فیض صاحب نے بھی اس نظم میں حالانکہ سوال کیا ہے، لیکن درحقیقت وہ اس کا جواب بھی دے رہا ہے کہ اب کیا کرنا ہے، جدوجہد کرنی ہے اور انسان کو مایوس نہیں ہونے دینا۔

عابد میر نے کہا کہ حالانکہ یہ نظم سن اَسی کی دہائی میں لکھی گئی ہے لیکن اس کا تاثر ایسا ہے کہ جیسے کوئی بھی انقلابی اپنے انقلاب کے خواب کے ریزہ ریزہ ہونے پہ دل کے پھپھولے پھوڑتا ہے۔ آخری سطریں گویا آج کے طالبان ازم اور آج ہی کے روز پشاور کے چرچ میں ہوئے واقعہ کا قصہ بیان کر رہی ہوں۔ فیض صاحب کی شاعری کا مجموعی تاثر کچھ ایسا رجائیت بھرا ہے کہ نظم سوالیہ انداز میں ختم ہونے کے باوجود امید دلاتی نظر آتی ہے۔

نشست کے آخر میں مہمان ساتھیوں نے مختصراً اسلام آباد کی ادبی فضا اور وہاں ہونے والی سنگت پوہ وزانت کی سرگرمیوں کا احوال بتایا، جو ڈاکٹر علی کیل قزلباش کی کاوشوں سے تسلسل کے ساتھ جاری ہیں۔ نیز جوہر بنگلزئی نے بتایا کہ ڈیرہ مراد جمالی میں بھی سنگت اکیڈمی کی شاخ قائم کر دی گئی ہے۔

اکتوبر:

اوستہ محمد

سنگت اکیڈمی آف سائنسز اوستہ محمد کے زیر اہتمام پوہ وزانت کی نشست کا اہتمام اتوار 20 اکتوبر 2013 کی شام سٹار اکیڈمی میں ہوا۔ نشست کی صدارت سنگت اکیڈمی کے سیکریٹری جنرل ظفراللہ زہری نے کی، نظامت کے فرائض پوہ وزانت کے انچارج عبدالرشید موم نے ادا کیے۔

''تعلیم'' موضوع تھا۔ علی گل پندرانی، ریاض احمد، خالد میر، عابد میر، اسرار شاکر، زاہد حفیظ، وحید تبسم، عبدالرشید موم، نثار احمد، غلام رسول، غلام دستگیر رند، اصغر علی نے اظہار خیال کیا۔

دوسرے حصے میں شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

اسلام آباد

ڈاکٹر علی کمیل کے گھر پر سنگت کا ہنگامی پوھوزانت ہوا۔ ڈاکٹر مری لاہور اردو کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہا تھا۔ بلوچستان کے شعرا کی نمائندگی کے لئے اس کے ساتھ محسن چنگیزی بھی تھا۔ اس نشست میں ڈاکٹر علی کمیل قزلباش، پروفیسر برکت علی، ڈاکٹر عبداللہ جان عابد، طارق الیاس، فیصل گوندل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے بلوچی لیکچرر ضیاالرحمان بلوچ موجود تھے۔ ضیا بلوچ نے بلوچی اکیڈمی بلوچستان پر تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ جس میں اکیڈمی کے آغاز، انتظامی ڈھانچے اور اشاعتوں پر تفصیلی گفتگو کی۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک سرکاری ادارہ ہے اس کے فنڈ بھی سرکار کی طرف سے آتے رہے ہیں اس لیے اس اکیڈمی کے زیرِ نگرانی انہی چیزوں کی اشاعت ممکن ہوئی جو سرکاری پالیسی کے مطابق تھیں۔ اس میں زیادہ تر اسلامی موضوعات پر کتب شائع ہوئیں۔ اسلامی خوراک، اسلامی چال ڈھال اور اس جیسے اور موضوعات پر بہت سی کتب لکھوائی گئیں۔

ڈاکٹر عبداللہ جان عابد نے کہا کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس اکیڈمی کے جو اغراض و مقاصد متعین کیے گئے تھے ان کی تکمیل کی کتنی سعی کی گئی ہے۔ اور کس حد تک مقاصد کا حصول ممکن ہو سکا ہے۔ کیا مکمل مقاصد حاصل کر لیے گئے ہیں یا ان کا کچھ حصہ؟ پروفیسر برکت علی نے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اکیڈمیوں کا اصل ہدف اس زبان میں تحقیقی رجحانات پیدا کرنا ہے اور ساتھ ہی اس زبان کے لوک ادب کا تحفظ کرنا ہے اگر کوئی اکیڈمی اس نہج سے ہٹتی ہے تو اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری نے کہا کہ ادارے کے مقصد وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہیں کچھ باغی لوگ بھی ادارے کے سربراہ بنے جنہوں نے آزادانہ منشور بنایا۔ بلوچی اکیڈمی کے متوازی بھی کئی ادارے موجود رہے ہیں جن میں پروگریسو موومنٹ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

طارق الیاس نے کہا مضمون نگار نے بلوچی اکیڈمی کا جامع تعارف پیش کیا ہے کیونکہ یہ ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع بھی ہے اس لیے ان کو دیکھنا چاہیے کہ بلوچی زبان و ثقافت پر کس قدر کام ہوا ہے، کیا بلوچستان کی مقامی زبانوں اور بولیوں پر بھی کوئی تحقیق اس اکیڈمی کے زیرِ اشاعت دستیاب ہے۔

نشست کے کا دوسرا حصہ شاعری پر مشتمل تھا، جس میں سنگت کے سیکرٹری ڈاکٹر عبداللہ جان عابد نے اپنی دو پشتو غزلیں پیش کر کے داد حاصل کی۔ ان کے علاوہ فیصل گوندل نے دو اردو غزلیں سنا کر شرکا کو محظوظ کیا۔

محسن چنگیزی چونکہ اس نشست کے مہمان تھے، سو ان سے بہت سا کلام سنا گیا۔

کوئٹہ

سنگت پوہ زانت کی ماہ اکتوبر کی نشست کا انعقاد 27 اکتوبر 2013ء بروز اتوار شام سنگت بک شاپ عظیم سنٹر بالمقابل مری لیب میں ہوا۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری نے اپنا مضمون پڑھ کر سنایا۔ مضمون پر وحید زہیر، جیئند خان، جہاں آرا تبسم، شاہ محمود شکیب، کلا خان خروٹی، نصر اللہ وزیر، قاسم بلوچ، محمود ابڑو اور جاوید اختر نے بحث کی۔

اس گفتگو کے بعد سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے کنونشن کی تیاری کے لیے ڈاکٹر منیر رئیسانڑیں، وحید زہیر اور جیئند خان پر مشتمل سہ رکنی کمیٹی کی رپورٹ ڈاکٹر میر رئیسانڑیں نے پڑھ کر سنائی اس پر بحث کے بعد مندرجہ ذیل فیصلے کیے گئے:

کنونشن کے مقالہ نگار ڈاکٹر نصر اللہ وزیر، جہاں آرا تبسم، وحید زہیر، قلا خان خروٹی، جیئند خان و عابد میر ہوں گے، جو اپنے اپنے مقالے 17 نومبر 2013 تک ڈاکٹر منیر رئیسانڑیں کو پہنچائیں گے۔

کنونشن 24 نومبر 2013ء بلوچی اکیڈمی میں منعقد ہوگا۔ جس میں پہلا سیشن مقالوں پر مشتمل ہوگا۔ بعد میں الیکشن ہوں گے اور آخر میں بین السانی مشاعرہ ہوگا۔

کتابوں پر تبصرے کے لیے ''لٹ خانہ'' پر گل بنگلزئی اور بیرم غوری کا تبصرہ ہوگا۔

''سنگت ادبی تحریک'' پر افضل مراد کا تبصرہ ہوگا۔

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے کوئٹہ یونٹ کی تشکیل کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس اگلے اتوار 3 نومبر 2013 کو سنگت بک شاپ میں منعقد ہوگا۔

آخر میں سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی نوخیز برانچز اسلام آباد، اوستہ محمد، ڈیرہ مراد جمالی اور خاران یونٹس کا خیر مقدم کیا گیا اور ان میں منتخب عہدے داروں کو مبارک باد پیش کی گئی۔

خاران

27 اکتوبر کو نصیر کبدانی لبزانکی دیوان کے کارگس میں زیرِ صدارت پروفیسر شکور زاھد ایک اجلاس منعقد کیا گیا۔ جس میں سنگت اکیڈمی آف سائنسز کا خاران میں یونٹ کی بنیاد رکھی گئی۔ جس میں،

جنرل سیکرٹری: پرافیسر شکور زاھد

ڈپٹی سیکرٹری جنرل: ضیاء شفیع

انچارج پوہ زانت: زین العابدین زینل

ضلعی کمیٹی ممبرز: نور احمد صابر، توقیر زرمبش، جی۔ آر شاری، عصمت دوستین اور شاہ فیصل فلک منتخب کئے گئے۔

آخر میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں شکور زاہد، ضیا شفیع، کلیم ارمان، جی۔ آر شاری، توقیر زرمبش، عصمت دوستین، فیصل فلک نے اپنے اشعار پڑھے۔

ڈیرہ مراد جمالی

پوہ زانت سنگت اکیڈمی آف سائنسز ڈیرہ مراد جمالی یونٹ کے انتخابات ہوئے۔

سیکریٹری جنرل جوہر بنگلزئی، ڈپٹی سیکریٹری جنرل شمس ندیم اور انچارج پوہ زانت امام بخش شیدائی منتخب ہوئے۔ ضلعی کمیٹی کے ممبران میں جاوید ساجد، سراج احمد منتخب ہوئے۔

نومبر:

مرکزی کمیٹی

سنگت کانفرنس 2013 کی تیاریوں کے سلسلے میں مرکزی کی طویل میٹنگ ہوئی۔

کانفرنس کی تفصیلات پر بحث ہوئی اور مختلف فیصلے کیے گئے۔

نئی کابینہ کی حلف برداری بھی اسی تقریب میں ہوگی۔

آئین

دفعہ نمبر 1 ادارہ ہٰذا کا نام: سنگت اکیڈمی آف سائنسز بلوچستان

دفعہ نمبر 2 ادارہ ہٰذا کے صدر دفتر کا پتہ: مری لیب فاطمہ جناح روڈ کوئٹہ

دفعہ نمبر 3 ادارہ ہٰذا کی سرگرمیوں کا علاقہ: بلوچستان/پاکستان

دفعہ نمبر 4 ادارہ ہٰذا کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل ہوں گے؛

(الف) ادب کا فروغ اور ادیبوں کی فلاح و بہبود

(ب) تحقیقی کام اور تحقیقی کاموں میں معاونت

(ج) سائنسی علوم کی ترقی اور ترویج

(د) ثقافت و فنون لطیفہ کی ترقی و ترویج

دفعہ نمبر 5 رکنیت **(الف)** ۔ ہر بالغ مرد، عورت ادارہ ہٰذا کا رکن بن سکتا ہے بشرطیکہ:

ا۔ ذہنی طور پر متوازن ہو

۲۔ اس کی عمر اٹھارہ سال سے زائد ہو

۳۔ ادارہ ہٰذا کے اغراض و مقاصد و دستور ہٰذا سے متفق ہو

۴۔ چندہ رکنیت ادا کرے

۵۔ جو مبلغ -/300 روپیہ سالانہ چندہ ادا کرے۔

(ب) طریقہ کار برائے رکنیت:

ہر وہ شخص جو آئینی طور پر رکنیت کے قابل ہو۔ وہ مجوزہ فارم پر ضلعی کمیٹی کو درخواست کرے گا۔ ضلعی کمیٹی ایسی درخواستوں کو قبول یا رد کرنے کی مجاز ہوگی۔ درخواست مسترد کرنے کی صورت میں ضلعی کمیٹی تحریری طور پر وجوہ بتائے گی۔ وہ شخص جس کی درخواست برائے رکنیت ضلعی کمیٹی مسترد کردے گی اس کو جنرل باڈی سے اپیل کا حق ہوگا۔ جس کا فیصلہ آخری اور حتمی ہوگا۔

(ج) حقوق رکنیت:

ارکان ہی جنرل باڈی کے رکن ہوں گے اور وہی انتخاب میں حصہ لے سکیں گے اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں گے۔ اور ان کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔

(د) رکنیت سے معطل/منسوخی کا طریقہ کار:

۱۔ اگر رکن ایک سال کے اندر فیس ادا نہ کرے تو اس کی رکنیت خود بخود منسوخ ہوجائے گی۔

۲۔ اجلاس میں غیر حاضری (جنرل باڈی یا ضلعی کمیٹی): جو رکن اطلاع دیے بغیر جنرل باڈی یا ضلعی کمیٹی کے تین لگاتار اجلاسوں میں غیر حاضر رہے تو جنرل باڈی یا ضلعی کمیٹی جس کا وہ رکن ہے، اسے اس کی رکنیت کی منسوخی کا اختیار ہوگا۔

۳۔ اگر ضلعی کمیٹی کے پاس معقول جواز ہو کہ کسی رکن کا کردار ادارہ کے منافی یا ادارہ کی بدنامی کا باعث ہے تو ضلعی کمیٹی ایسے رکن سے اس کے کردار کے متعلق وضاحت طلب کرے گی، وضاحت غیر تسلی بخش ہونے کی صورت میں ضلعی کمیٹی ایسے رکن کو تنبیہ کرے گی یا رکنیت معطل کرے گی۔ اگر متعلقہ رکن مستعفی ہونے سے انکار یا اپنے کردار کی تصحیح نہ کرے تو ضلعی کمیٹی کل تعداد 3/4 اکثریت سے رکن کی رکنیت تحریری وجوہ کے ساتھ منسوخ کرے گی۔

۴۔ اگر کوئی رکن اپنے طور پر مستعفی ہوجائے تو ضلعی کمیٹی اس کا استعفیٰ منظور کرنے کی مجاز ہوگی۔ بشرطیکہ اس نے واجبات ادا کردیے ہیں۔

(ر) بحالی رکنیت کا طریقہ کار:

۱۔ اگر معطل شدہ رکن کو دستور ہٰذا کے مطابق دوبارہ رکن بنانا ہو تو وہ فیس ادا کرے تو اس کی رکنیت خود بخود بحال ہوجائے گی۔ لیکن منسوخ شدہ رکن کو دستور ہٰذا کے مطابق دوبارہ رکن بنانا ہوگا۔

۲۔ جن ارکان کی رکنیت ضلعی کمیٹی نے منسوخ کردی ہو تو ان کو جنرل باڈی سے اپیل کا حق حاصل ہوگا اور جنرل باڈی کا فیصلہ حتمی ہوگا۔

دفعہ نمبر 6 ادارے کا انتظامی ڈھانچہ:

ادارہ ہٰذا مرکزی کمیٹی، ضلعی کمیٹی، ضلعی جنرل باڈی اور مرکزی جنرل باڈی پر مشتمل ہوگا۔

۱۔ ضلعی جنرل باڈی:

ضلع بھر کے ممبران پر مشتمل ہوگی۔ یہ ضلعی کمیٹی کے ممبران کا انتخاب کرے گی۔ ضلعی یونٹ کی کارگزاریوں اور اجلاس کاروائی کی توثیق کرے گی۔ عدم اعتماد کی تحریک پر غور کرکے فیصلہ کرے گی۔ اکاؤنٹ کی جانچ پڑتال کرے گی۔ ضلع کے لئے ایک سیکریٹری جنرل، ایک ڈپٹی سیکریٹری جنرل، ایک انچارج پوہ زانت اور چار ارکان کا انتخاب کرے گی۔ یہ انتخابات ہر دو سال بعد ہوں گے۔ ضلعی جنرل باڈی سال میں کم از کم تین بار ملے گی۔

۲۔ ضلعی کمیٹی ہر دو ماہ ملا کرے گی۔ ضلعی تنظیم کی ترقی، تنظیم دیکھے گی۔ ماہانہ پوہ زانت نشستوں کے باقاعدہ انعقاد کو یقینی بنائے گی۔ پوہ زانت نشستوں کے پہلے حصے میں سماجی معاشی و سیاسی عنوانات پر بات ہوگی جبکہ دوسرا حصہ ادبی ہوگا۔ ضلعی کمیٹی کا سیکریٹری جنرل مرکزی کمیٹی کا ممبر ہوگا۔

1- جنرل باڈی:

(الف) تشکیل: جنرل باڈی ادارہ ہٰذا کے تمام کے تمام اراکین پر مشتمل ہوگی۔

فرائض واختیارات:

۱۔ ادارہ ہٰذا کی پالیسی کی تشکیل کرے گی۔

۲۔ مرکزی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب کرے گی۔

۳۔ادارے کی کارگزاریوں اوراجلاس کی روئیداد کی توثیق کرے گی۔

۴۔ادارے کی سالانہ رپورٹ پرغور کرنے کے بعد منظوری دے گی۔

۵۔عدم اعتماد کی تحریک پرغور کرکے فیصلہ کرے گی۔

۶۔دستورہٰذا میں مجوزہ ترمیم کی توثیق کرے گی۔

۷۔ادارہ ہٰذا کی جانچ پڑتال اورآڈٹ کے لیے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ مقرر کرے گی۔

۸۔مرکزی کمیٹی کی طرف سے فیصلہ طلب اور دیگر اموراوراپیلوں کا فیصلہ کرے گی۔

۹۔تمام اختیارات جو اس دستور میں جنرل باڈی کوتفویض کیے گئے ہوں، استعمال کرے گی۔

2۔مرکزی کمیٹی:

(الف) تشکیل: مرکزی کمیٹی تین (3) عہدیداروں اورضلعی سیکریٹری جنرلوں اور تین ایسے اراکین پر مشتمل ہوگی جن کو جنرل باڈی منتخب کرے گی۔

(ب) فرائض واختیارات:

۱۔جنرل باڈی کی پالیسی کی روشنی میں ادارہ کے اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہے گی اورمناسب عملی اقدامات کرے گی۔

۲۔مرکزی کمیٹی ادارہ ہٰذا کی کارکردگی کے آخری نصف حصے میں خالی نشست کو باقی ماندہ مدت کے لیے پر کرے گی۔سالانہ رپورٹ اورآئندہ سال کا بجٹ پیش کرے گی اوراس کی جنرل باڈی منظوری دے گی۔

۳۔تمام اختیارات استعمال کرے گی جو کہ مرکزی کمیٹی کو دستور میں کسی اور جگہ دیے گئے ہوں گے۔

دفعہ نمبر7 عہدیداراوران کے فرائض واختیارات:

الف: سیکرٹری جنرل

ب: ڈپٹی سیکرٹری

(الف): سیکرٹری جنرل:

۱۔یہ ادارہ کے تمام اجلاس خواہ وہ جنرل باڈی کے ہوں یا مرکزی کمیٹی کی صدارت کرے گا۔

۲۔یہ ادارے کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مبلغ =/15000 روپیہ یکمشت خرچ کرنے کا مجاز ہوگا جس کی منظوری مرکزی کمیٹی کے آئندہ اجلاس میں حاصل کرنا ضروری ہوگی۔

۳۔برابر ووٹ کی صورت میں خصوصی رائے استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔

۴۔ناخوشگوار ماحول میں اجلاس کوملتوی کرنے کا بھی مجاز ہوگا۔

۵۔اضلاع کی تنظیم سے رابطہ رکھے گا۔ بالخصوص وہاں پوہ زانت کی باقاعدگی میں معاونت کرے گا۔

۶۔دیگرادبی سماجی اورکلچرل تنظیموں سے روابط رکھے گا۔

(ب) ڈپٹی سیکرٹری:

۱۔ہر دومجالس کا جنرل سیکرٹری ہوگا۔

۲۔سیکرٹری جنرل کے مشورے اورمنظوری سے ہر دومجالس کا اجلاس طلب کرے گا۔ ایجنڈا جاری کرے گا۔

۳۔باضابطہ کارروائی لکھے گا جس کی توثیق سیکرٹری جنرل سے اگلے اجلاس میں کرائے گا۔

۴۔سالانہ رپورٹ تیار کرکے مرکزی کمیٹی کی منظوری حاصل کرکے جنرل باڈی میں پیش کرے گا۔

۵۔مبلغ =/10000 روپیہ یکمشت خرچ کرنے کا مجاز ہوگا۔اس کی منظوری مرکزی کمیٹی سے آئندہ اجلاس میں لیناضروری ہوگی۔

۶۔سیکرٹری جنرل کی عدم موجودگی میں اس کے فرائض واختیارات استعمال کرے گا اور وہ تمام امور سرانجام دے گا جو سیکرٹری جنرل اسے تفویض کرے۔

۷۔مالی اموراورآمدنی وخرچ کا ذمہ دار ہوگا۔

۸۔آمد وخرچ کی ماہوار رپورٹ مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں پیش کرے گا۔

۹۔مقررشدہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے آڈٹ کرائے گا۔

۱۰۔ادارہ کی تمام رکنیت چندہ عطیات کی کاپیاں اپنی تحویل میں رکھے گا اور متعلقہ افراد کو بھی جاری کرے گا اور تمام رقوم ادارہ کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرائے گا۔

(ج) **سیکرٹری نشر و اشاعت**: پروپیگنڈہ اور تعلقات عامہ کا ذمہ دار ہوگا۔

دفعہ نمبر 8 اجلاس بلانے اور منعقد کرانے کا طریقہ کار:

۱۔ ہر دو مجالس کے اجلاس کے لیے اراکین کو ایجنڈا بھیجنا لازمی ہوگا۔

۲۔اگر اراکین کے بار بار اصرار پر بھی سیکرٹری جنرل یا ڈپٹی سیکرٹری جنرل باڈی یا مرکزی کمیٹی کا اجلاس نہ بلائیں تو جنرل باڈی کے کم از کم ایک تہائی اراکین سات دن کا نوٹس برائے طلبی اجلاس سیکرٹری جنرل یا ڈپٹی سیکرٹری کو دیں گے۔ اگر تب بھی اجلاس نہ بلایا جائے تو متعلقہ اراکین خود حسب دستور اجلاس بلانے کے مختار ہوں گے۔ اور اس اجلاس کا ایجنڈا بذریعہ رجسٹری متعلقہ اراکین کو بھی بھیجا جائے گا اور ایسے اجلاس کے فیصلے آئینی ہوں گے۔

دفعہ نمبر 9 معیاد نوٹس و کورم برائے جنرل باڈی:

۱۔انتخابات یا عام اجلاس کے لیے معیاد نوٹس پندرہ دن، خاص اجلاس کے لیے سات دن اور ہنگامی اجلاس کے لیے تین دن لازمی ہوگی۔

۲۔ ہر اجلاس کے لیے اراکین کی کم از کم تعداد ایک تہائی ہونا ضروری ہوگی۔ بصورت دیگر اجلاس ملتوی ہو جائے گا۔

دفعہ نمبر 10 معیادِ نوٹس کورم برائے مرکزی کمیٹی:

۱۔ عام اجلاس بلانے کے لیے پانچ دن، خصوصی اجلاس بلانے کے تین اور ہنگامی اجلاس بلانے کے کم از کم ۲۴ گھنٹے قبل نوٹس دینا لازمی ہوگا۔

۲۔مرکزی کمیٹی کے ہر اجلاس کے لیے کم از کم 1/3 ارکان کی حاضری لازمی ہوگی۔ بصورت دیگر اجلاس کسی اور تاریخ پر ملتوی ہو جائے گا۔

دفعہ نمبر 11 مالیات:

۱۔ادارہ کا مالی سال یکم جنوری سے شروع ہوگا۔

۲۔ بینک سے رقوم نکالنے کے لیے سیکرٹری جنرل اور ڈپٹی سیکرٹری کے دستخط لازمی ہوں گے۔

۳۔ادارہ کی رقوم صرف اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے استعمال ہوں گی۔

۴۔حسابات کا سالانہ آڈٹ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے کرایا جائے گا۔

دفعہ نمبر 12 دستوری ترمیم:

جنرل باڈی دستور میں ترمیم کرنے کے لیے خاص اجلاس بلائے گی۔ اراکین کی تین چوتھائی اکثریت سے تجویز شدہ ترمیم کا فیصلہ کرے گی۔

دفعہ نمبر 13 تحریک عدم اعتماد:

جنرل باڈی یا مرکزی کمیٹی کی مجموعی تعداد کے ایک تہائی (4/3) ارکان تحریری مطالبہ پر ادارہ کے کسی عہدیدار کے خلاف صرف جنرل باڈی کے اجلاس میں تحریک عدم اعتماد پیش کی جا سکے گی۔ جس کی منظوری کے لیے دو تہائی (2/3) ارکان کی منظوری لازمی ہوگی۔

دفعہ نمبر 14 متفرقات:

۱۔(الف): ادارہ ہٰذا کی ضلعی اور مرکزی کمیٹی کے عہدیداران اور ممبران کی معیاد رکنیت بذریعہ انتخاب دو (2) سال کے لیے ہوگی۔

(ب) عہدیداران کی معیاد ختم ہونے سے پہلے تیس (30) دن کے اندر نئے انتخابات کرانے لازمی ہوں گے۔

(ج) مرکزی کمیٹی اس مقصد کے لیے ایک انتخابی کمیشن تشکیل دے گی جو انتخابات کا انعقاد اور نگرانی کرے گی۔

۲۔ تمام امور کا فیصلہ سوائے ان امور کے جن کا اس دستور میں خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، اجلاس میں موجود ارکان کی کثرت رائے سے ہوگی۔

۳۔ضلعی و مرکزی جنرل باڈی یا مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں رائے شماری ہاتھ اٹھانے کے طریقہ یا اگر ضروری سمجھا جائے تو خفیہ پرچی کے ذریعے ہوگی۔

ویب سائٹ

سنگت اکیڈمی کی ویب سائٹ گذشتہ ایک دَہائی سے سرگرم ہے:www.sangatacademy.net۔اس کے تین حصے ہیں۔ایک حصہ ''میگزین'' کے نام سے ہے جس میں رسالہ ''سنگت'' ہر ماہ اپ لوڈ کیا جاتا ہے۔اوراس میں گذشتہ پانچ سال کے پورے شمارے موجود رہتے ہیں۔ دوسرا حصہ ''سنگت لائبریری'' کے نام سے ہے جہاں دودرجن سے زائد کتابیں موجود ہیں۔تیسرا حصہ سنگت اکیڈمی کی خبروں کا ہوتا ہے۔

سنگت اکیڈمی کے سیکرٹری جنرل ، ڈپٹی سیکرٹری جنرل اور انچارج پوہ زانت کے ای میل ایڈریس بالترتیب یہ ہیں:

Sec-gen@sangatacademy.net

dysec-gen@sangatacademy.net

Pz@sangatacademy.net

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے سربراہان

1- شاہ محمد مری — سال1997 تا سال2008

2- سرور آغا — سال2008 تا سال2009

3- وحید زہیر — سال2009 تا سال2011

4- ڈاکٹر منیر رئیسانڑیں — سال2011 تا سال2013